ماہنامہ
گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

JUNE 2008

جون
2008

Reg: CPL No: 80
Reg: SR - 01

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

صداقت
اللہ
محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔
☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔
☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔
☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشورِ دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ
وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغٰفِلِيْنَ ط

الاعراف ۔ 205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے
ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح و شام
یاد کرو ۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا ۔

ماہنامہ فلاح آدمیت گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاری رح

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
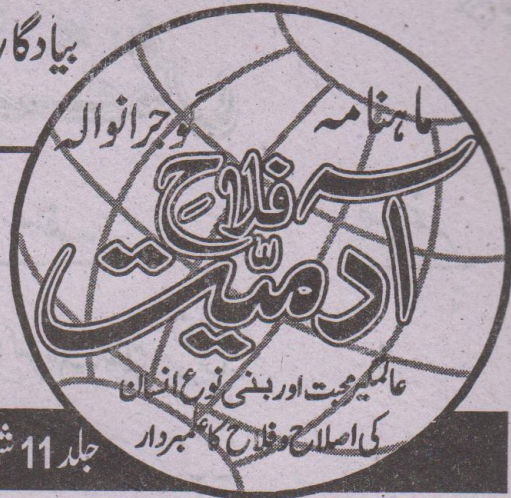
جلد 11 شمارہ 9 جون 2008ء جمادی الاول 1429ھ

ایڈیٹر وحید احمد

سرکولیشن مینجر میاں علی رضا

قیمت ———— -/20 روپے

سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:055-3862835

Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:055-3881379

Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020

E-mail: info@toheedia.net

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درس قرآن

یوسف

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰؒ)

نام

سیدنا یوسف علیہ السلام کے واقعے کی مناسبت سے اس سورۃ کو''یوسف'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

زمانہ نزول

بعض مفسرین نے اس سورۃ کا زمانہ نزول بھی مکی زندگی کا آخری دور قرار دیا ہے جبکہ عام مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریمﷺ اپنے ساتھیوں سمیت شعبِ ابی طالب میں محصور تھے۔اس دور کی وحی میں ایک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ تخاطب صرف نبی اکرمﷺ کی ذات کے لئے ہے گویا کہ باقی مسلمان آپؐ سے کبھی الگ نہ ہونے والے جان نثار ہیں۔

شانِ نزول اور مضامین

اس سورۃ کے نزول کا فوری سبب کفار مکہ کا ایک سوال تھا کیونکہ اہل مکہ اس تصور کے ساتھ سوال کررہے تھے کہ قرآن کریم آپ کا اپنا کلام ہے اور آپؐ اس کی تزئین کے لئے سابقہ اقوام کے حالات و واقعات یہودیوں سے سن کر اس میں شامل کر لیتے ہیں۔اس سوال کے پس منظر میں یہ خیال واضح نظر آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب کے طور پر یہ سورۃ آپؐ پر نازل فرمائی اور نفس مضمون (کہ بنی اسرائیل مصر کس طرح پہنچے) کے پہلو بہ پہلو کچھ اور حقائق کو بھی کھول دیا مثلاً قریش مکہ اپنے اور محمدﷺ کے معاملات پر غور کریں کہ ان واقعات میں کس قدر مماثلت ہے اور اس بات پر متنبہ کرنے کی لئے آیات للسائلین (سائلوں کے لئے نشانیوں) کے اصطلاح بیان کی گئی اسی

طرح اس جواب کو منجانب اللہ ہونے کی بابت فرمایا:

ذلك من انباء الغيب نوحيه اليك ■ وما كنت لديهم اذا جمعوآ امرهم وهم يمكرونo

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیں اور جب وہ سازش کر رہے تھے، آپ وہاں پر موجود نہ تھے۔'' (یوسف:102)

اسی طرح سورۃ کے اختتام کے قریب فرمایا:

لقد كان فی قصصهم عبرة لاولی الالباب۔

''بے شک ان کے واقعات میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے'' (یوسف:111)

آیات مذکورہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر سورۃ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ قرآن کریم کس وضاحت کے ساتھ اہل مکہ کو سابق اور موجودہ حالات کی پیش نظر دعوت فکر دیتا ہے نیز غور و تدبر کے لئے کچھ پیش گوئیاں بھی اس میں اشارۃً موجود ہیں۔

قریش مکہ نے آپ کے ساتھ برادران یوسف سے مختلف معاملہ نہ کیا تھا جیسے انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک کر اپنی کامیابی کا یقین کر لیا تھا (حالانکہ وہ خود فریبی کا شکار ہوئے تھے) اسی طرح اہل مکہ نے بھی آپؐ کے پیغام حق کو مٹانے کی پوری کوشش کی اور آپ کے قتل تک کے منصوبے بنائے گئے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کو جلاوطنی کے دور میں عروج ملا اور ان کے بھائی انتہائی بے چارگی اور کسمپرسی کے عالم میں ہاتھ پھیلا کر ان کے سامنے التجا کرنے پر مجبور ہو گئے کہ تصدق علینا۔ ہم پر صدقہ کیجئے۔

اسی طرح یہ معاملہ عنقریب تم اہل مکہ کے ساتھ بھی پیش آ کر رہے گا اور پھر آنے والے ادوار نے اس پیش گوئی کو حرف بحرف سچ ثابت کر دیا۔ جب نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کے کچھ عرصہ بعد دوبارہ مکہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے تو قریش مکہ سرنگوں، شکست خوردہ، سراپا ندامت و خجالت بنے کھڑے تھے اور سب کی زبان پر حضور اکرم ﷺ کے لئے یہی الفاظ تھے اخ کریم وابن اخ کریم صاحب عزت اور قابل احترام بھائی اور صاحب عزت اور قابل احترام بھائی

کا بیٹا!

اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ میں آج تمہیں وہی کچھ کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو"

گویا یہ پورا واقعہ اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا ہے لیکن بین السطور نبی اکرم ﷺ اور کفار کے مابین کشمکش کے حالات بھی ضمناً بیان ہو گئے ہیں۔ گویا "گفتہ آید در حدیث دیگراں" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

اس پورے واقعے میں تاریخی یا قصہ گوؤں والا انداز اختیار نہیں کیا گیا بلکہ اس واقعے میں ہدایت وموعظت کے ہر پہلو پر دعوت فکر دے کر ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قید خانے میں یہ ارشاد کہ سیدنا ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور یوسف علیہ السلام اسی دعوت دین کے علمبردار تھے جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ اور جب کردار کے تقابل کا معاملہ درپیش ہوا تو یوسف علیہ السلام تاجروں کے قافلے، عزیز مصر اور اس کی اہلیہ، حکام مصر اور آخرت پر یقین رکھنے والوں کا کردار کیا ہے؟ اور اس کے مقابل دنیوی جاہ وتمکنت اور آخرت سے بے خوف انسانوں کا کردار کیا ہے؟

اسی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بھی واضح کردیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیں تو کائنات کی ساری تدبیریں الٹ جاتی ہیں مثلاً برادران یوسف کی تدبیر، جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ شرمندگی وندامت سے سر جھکا کر اپنے ہی بھائی کے حضور مجرموں کے سے انداز میں کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے۔

عزیز مصر کی اہلیہ کی انتقامی کارروائی کے نتیجے میں حضرت یوسفؑ کا جیل جانا اور پھر اس عورت کا بھرے دربار میں خفت وشرمندگی سے اپنے جرم کا اقرار کرنے پر مجبور ہونا وغیرہ۔ ان واقعات میں ہر انسان کو سبق دیا گیا کہ تم اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوئی باطل وغلط راستہ مت اپناؤ کیونکہ کامیابی وناکامی مشیت الٰہی پر منحصر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے مقاصد کے حصول کے لئے غلط راستوں کا انتخاب کرے گا، تو اللہ کی گرفت سے کسی طرح چھٹکارا ممکن نہیں

اور یہ بات تبھی نصیب ہوگی جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر مکمل توکل اور بھروسا ہو۔ انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اسباب خیر کو اختیار کرکے نتائج کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا طلب گار بن جائے۔ اس راستے میں پیش آمدہ مشکلات وحوادث کو قطعاً سدراہ نہ سمجھے اور اس کی مثال کے طور پر تاریخ کی مصدقہ حقیقت کے انداز میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو پیش کیا کہ انہوں نے بیگانگی، بے وطنی، بے سروسامانی، کمزوری اور غلامی کے باوجود ایمان باللہ کے جذبہ صادق اور سیرت وکردار کے بل بوتے پر اپنوں اور بیگانوں کو کس طرح مسخر کیا اور جب آپ نے زمام اقتدار سنبھالی تو اس کے بعد اپنے والدین اور بھائیوں کو مصر آنے کی دعوت دی اور جو خواب آپ نے بچپن میں اپنے والد گرامی کو سنایا تھا، آج اس کی عملی تعبیر سامنے تھی۔

اہل مکہ کو ان کے سوال کا جواب مفصل طور پر دے دینے کے بعد فرمایا کہ اب غور وتدبر کا ایک اور موقع تمہارے ہاتھ میں ہے اور عبرت وموعظت کے سارے سامان موجود ہیں اور قانون فطرت یہ ہے کہ جب اہل ایمان ظاہری حالات کے پیش نظر مایوس ہونے لگتے ہیں تو ہماری نصرت واعانت ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ نیز ہماری گرفت سے کوئی مجرم بچ نہیں پاتا۔ پھر یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی کہ قرآنی قصص وواقعات کا مقصد افسانہ گوئی یا تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ قرآن کے ہر قصے میں، بہت سے نصیحتیں اور اسباق پوشیدہ ہیں۔

قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے رموز

سورہ یوسف مکی ہے جو حضور اکرم ﷺ کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ اس وقت مدینہ کے یہود نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک سوال بھیجا کہ وہ بتائیں کہ وہ نبی کون ہے اور اس کا کیا قصہ ہے کہ جس کا باپ اس کے فراق میں روتے روتے اندھا ہو گیا تھا؟

دراصل مدینہ کے لوگ جب مکہ آتے، تو اہل مکہ ان سے حضور ﷺ کا ذکر کرتے۔ اس پر ان لوگوں نے حضور ﷺ کو کچھ ایسے سوال بھیجے جن کا صحیح علم صرف یہود مدینہ یا ان کی وساطت سے اہل مدینہ کے پاس تھا۔ اہل مکہ ان واقعات سے واقف نہ تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کے سوال کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ

نے سورۂ یوسف نازل فرمائی۔حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اجمالاً پہلے بیان کیا جاچکا ہے، صرف ایک بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ اس واقعے کے کردار سب رموز ہیں۔نام حضرت یوسف علیہ السلام اور برادران یوسف کا لیا جارہا ہے،لیکن جہاں یوسف علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، وہ آگے چل کے آپؐ کے قصہ کی شکل وصورت اختیار کرلیتا ہے اور جہاں جہاں برادران یوسف کا ذکر ہے وہاں اہل مکہ اور قریش کی نفسیات بیان ہورہی ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں یہی صورتحال ہے۔آپ قصہ موسیٰ وفرعون پڑھ لیں۔آپ محسوس کریں گے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے دراصل محمد رسول اللہ ﷺ کا قصہ بیان ہورہا ہے جہاں فرعون کا ذکر ہے، وہ قریش کی خصوصیات کے حامل لوگوں کی داستان ہے اور پیش گوئی ہے کہ قریش اسی انجام کو پہنچیں گے جس انجام کو فرعون پہنچا تھا اور حضور اکرم ﷺ اس مقام پر فائز ہوں گے جس مقام پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فائز کیا گیا۔

حد یہ ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے اہل قریش کے سامنے مکہ میں یہ کہا کہ آج میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہی تھی:

"آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔"

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا:

ے آں کہ بر اعداء در رحمت کشاد
مکہ را پیغام لا تثریب داد

اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ قصہ یوسف ہے یا قصہ محمد ﷺ ؟

مولانا روم نے فرمایا:

ے خوشتر آں باشد کے سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرٰ تلك ایت الکتب المبین٥

انا انزلنه قرانا عربیا لعلکم تعقلون٥

"الف، لام، را، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔ تاکہ تم اسے اچھی طرح سمجھ سکو۔" (یوسف: 1-2)

عربی زبان میں قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے ہے

کہا گیا کہ ہم نے اسے کتاب مبین بنایا ہے۔ مبین سے مراد وہ چیز ہے جو اپنا مدعا خود بیان کرے اور پھر اس کو عربی زبان میں نازل کیا جو دنیا کی بھرپور زبان ہے۔ تاکہ اہل عرب اس کو سمجھ سکیں۔ اس کتاب کو سمجھ کر پڑھو اور ہدایت پا جاؤ۔ یہاں یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ یہ رٹ لگاتے نہیں تھکتے کہ اس کتاب کو بغیر سوچے سمجھے پڑھ لینا بھی کافی ہے وہ لوگوں کو غلط راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید بغیر تلاوت کے ساتھ بار بار تعقل، تذکر اور فہم کی دعوت دیتا ہے اور خصوصاً اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لئے بصائر اور روشنی قرار دیتا ہے۔ بغیر سمجھے اس کو پڑھ کر مطمئن ہو جانا دراصل شیطان کی ایک چال ہے۔

اولاد سے مقاطعہ کی بجائے صبر و تحمل

سورہ یوسف میں ایک اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ برادران یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ زیادتی کی، ان کے کرتے پر جھوٹ موٹ خون کے چھینٹے لگا کر آ گئے اور اپنے باپ سے بھی دھوکا کیا، اس طرح ایک بہت بڑا جرم کیا۔

قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹے اتنی بڑی غلطی کر لیں تو باپ کے لئے ضروری نہیں کہ ان کے ساتھ مقاطعہ کر لے یا انہیں گھر سے نکال دے۔ جبکہ یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ آپ کے بیٹوں نے یوسف کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ لیکن باپ نے صبر کیا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ والدین

اصلاح کے لئے کوشش کرتے رہیں اور جلد بازی میں ان سے مقاطعہ نہ کریں اور نہ ان کو گھر سے نکال باہر کرنے کی کوشش کریں اور جب اولاد اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لے تو پھر انہیں فراخ دلی سے معاف بھی کر دیں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا۔ جب برادران یوسف علیہ السلام کی ساری چالیں کھل گئیں اور انہیں اپنے گناہوں کا احساس ہوا تو پھر انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور ان سے معافی مانگی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا:

قال سوف استغفرلکم ربی ط انه هو الغفور الرحیمo

''میں جلد اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعا کروں گا۔ بے شک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (یوسف:98)

اس پوری سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جیل کے اندر خطبہ بہت اہم اور بصیرت افروز ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنی پاک دامنی کے باوجود جیل جانا پڑا۔ معلوم ہوا کہ صالح لوگوں کو اپنی نیکی، تقویٰ اور پاک دامنی کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔ لیکن جیل میں بھی انہوں نے دین کی تبلیغ جاری رکھی۔ زندان کے ساتھی اردگرد آ بیٹھتے ہیں۔ ان میں سے دو افراد اپنے اپنے خوابوں کی تعبیر دریافت کرتے ہیں جس پر حضرت یوسف علیہ السلام ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

انی ترکت ملة قوم لایومنون باللّٰه وهم بالاخرةهم کفرونo

واتبعت ملة اباء ی ابراهیم واسحق ویعقوب ء ماکان لنا ان نشرك باللّٰه من شیء ،ذالك من فضل اللّٰه علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرونo

یصاحبی السجن ء ارباب متفرقون خیر ام اللّٰه الواحد القهارo

ماتعبدون من دونه الا اسماء سمیتموها انتم واباؤکم ما انزل اللّٰه بها من سلطن ء ان الحکم الا للّٰه ء امرالا تعبدوآ الا ایاه ،ذلك الدین القیم ولکن اکثر

الناس لا یعلمونo

''میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم اور یعقوب علیہ السلام کے مذہب کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا اکیلا اللہ کہ سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار واقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہ دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (یوسف:37-40)

نفس کی اقسام

سورہ یوسف میں ایک جگہ پر حضرت یوسف علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

وما ابری نفسی ۃ ان النفس لامارۃ ، بالسوء الا مارحم ربی ان ربی غفور رحیمہo

''میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا، نفس تو برائیوں ہی کی راہ سجھانے والا ہے۔ سوائے اس کے جب میرا رب رحم فرمائے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔'' (یوسف:35)

نفس امارہ

قرآن کریم میں نفس کا لفظ تین مختلف معنوں میں آیا ہے، ایک تو یہاں نفس امارہ کے معنوں میں یعنی وہ نفس جو برائی پہ ابھارتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس کو حیوانیت کا نام دیتے ہیں کہ انسان کے اندر نفس امارہ ہے جو انسان کو جانوروں والی حیوانیت اور سفا کیت پر ابھارتا ہے۔

نفس لوامہ

انسان کے اندر ایک اور نفس بھی ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے۔ وہ نفس لوامہ ہے، یعنی انسان

کواندر سے ٹوکنے والا، ملامت کرنے والا، آڈیٹر یا محتسب جس کو ہم ضمیر کہتے ہیں۔ یہ امر ربی اور روح کا مظہر ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اس کے لئے ملکیت کا نام استعمال کرتے ہیں کہ یہ فرشتوں کی صفات رکھتا ہے۔ اس طرح انسان بنیادی طور پر دو نفوس کا حامل ہے یعنی نفس امارہ اور نفس لوامہ۔ بھیمیت اور اول الذکر صفات جانوروں کی ہیں یعنی انسان زیادہ کھائے، زیادہ پیئے، زیادہ سوئے اور زیادہ لذت اُٹھائے اور اس امر میں اگر دوسروں کا حق مارنا پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔ جبکہ مؤخر الذکر نفس لوامہ (ملکیت) کی صفات یہ ہیں کہ وہ کم کھاتا، کم پیتا ہے اور کم سوتا ہے۔ ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اپنی ہر غرض سے بے نیاز ہوکر دوسروں کی خدمت کرتا چلا جاتا ہے۔

نفس مطمئنہ

مذکورہ دونوں صفات انسان کے اندر موجود ہیں اور ان کی مسلسل کشمکش اور لڑائی جاری رہتی ہے۔ اس لڑائی اور دنگل کے نتیجے میں یا تو نفس امارہ مستقل طور پر غالب آجاتا ہے جس سے انسان نرا حیوان بن جاتا ہے جسے آخر کار دوزخ کا ایندھن بننا ہوگا، یا پھر ایسا ہو کہ نفس امارہ کو نفس لوامہ رام کرلے اور نفس امارہ سے کہے کہ جناب! تمام نعمتوں سے لطف اٹھایئے لیکن تھوڑا سا اسے ترتیب دے لیجئے۔ ہمارے ساتھ ساتھ چلئے۔ یوں ضمیر حیوان کو رام کرلیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک صلح اور معاہدہ ہوجاتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں جو اطمینان کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے تو اس کیفیت کے نتیجے میں دونوں نفس مل کر ایک تیسری قسم کے نفس کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں اور پھر اطمینان سے منزل کی طرف رخ کیا جاتا ہے اور وہ منزل اللہ کی ذات ہے۔ فرمایا:

یاایتھاالنفس المطمئنۃo

ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃo

فادخلی فی عبدیoوادخلی جنتیo

''اے اطمینان حاصل کرلینے والے نفس، اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ۔ اس حالت میں

کہ تو اپنے پروردگار سے راضی ہو اور تیرا پروردگار تجھ سے راضی ہو۔ میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔'' (الفجر: 27-30)

یہ نفس کی تین اقسام ہیں۔ روزے کے ذریعے سے کوشش کی جاتی ہے کہ بہیمیت کا زور ٹوٹے اور ملکیت کا زور ابھرے۔ یوں اندر بیٹھا ہوا حیوان بے شک قوی ہو لیکن اس کو اس طرح سدھایا جائے کہ وہ سواری کا کام دے تا کہ انسان کی روح اور اس کا ضمیر اس پر سواری کرے اور اطمینان سے نفس مطمئنہ بن کر منزل کی طرف روانہ ہو۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سراست
مرد شو آور ز کام او بکف!
تاشوی گوہر اگر باشی خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پزیر از دیگراں
اہل قوت شو ز ورد یا قوی؟
تا سوار اشتر خاکی شوی

علم غیب کا منبع ذات الٰہی ہے

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کہ سورۂ یوسف میں قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ بہت سے رموز و اسرار بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس قصہ میں ایک بات قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے کے فراق میں روتے روتے نابینا ہو گئے۔ مصر میں بیٹھے بیٹھے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میری قمیض لے جاؤ اور میرے والد پر ڈال دو، ان کی بینائی لوٹ آئے گی۔ جب یہ لوگ مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ آج یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔ ابھی تو کرتہ ان کی طرف روانہ ہی ہوا تھا کہ خوشبو آنے لگی۔ شیخ سعدی شیرازیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

کسے پرسید زاں گم کردہ فرزند
اے روشن گوہر پیر خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی
چرا در چاہ درکنعانش ندیدی

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جب گھر سے جدا کیا گیا اور مار پیٹ کے بعد ان کو کنویں میں ڈال دیا گیا اور وہ مسلسل تین روز تک اسی گاؤں کے کنویں میں پڑے رہے تو اس وقت ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام روتے رہے اور کوئی خوشبو نہ آئی بلکہ انہیں یہ بھی پتا نہ چلا کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟ لیکن اس کے برعکس جبکہ قمیض ابھی سینکڑوں میلوں کے فاصلے پر ہے اور بیٹا اس سے زیادہ دور ہے تو انہیں بیٹے کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ ماجرا صرف اتنا سا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب چاہیں اور جسے چاہیں، علم عطا فرما دیتے ہیں لیکن انسان کا علم اتنا ہی ہے جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ عطا فرما دیں۔ شیخ سعدی اسی نکتے کی یوں وضاحت فرماتے ہیں:

بگفت احوال ما برق جہان است؟
گہے پیدا و دم دیگر نہاں است
گہے برطارم اعلیٰ نشینم
گہے برپشت پائے خود نہ بینم

اور اس حقیقت کو قرآن مجید یوں بیان کرتا ہے:

ذلك مـن انباء الغيب نوحيه اليك ج وما كنت لديهم اذ اجمعوا امرهم وهم يمكرونo

''(اے نبیؐ) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف بھیجتے ہیں اور جب برادران یوسف نے اپنی بات پر اتفاق کیا اور وہ فریب کر رہے تھے تو تم ان کے پاس نہ تھے۔'' (یوسف: 102)

اہل مکہ کو ان کے سوال کا جواب دے کر مطمئن کرا دیا اور پھر تدبر کی دعوت دی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قل هذه سبيلى ادعوا الى الله على بصيرة انا ومن اتبعنى وسبحن الله

وما انا من المشرکینo

وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیهم من اهل القری افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین من قبلهم o

''کہہ دیجئے! میرا راستہ تو یہی ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر۔ میں اور میرے پیروکار بھی (اللہ کی طرف بلاتے ہیں) اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے مرد ہی (نبی بنا کر) بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل کر نہیں دیکھا کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے تھے۔'' (یوسف:108-109)

آیت بالا میں یہ صراحت کردی گئی کہ زمین میں گھومنے پھرنے کا مقصد صرف تفریح (Enjoyment) ہی نہیں بلکہ اس دوران میں ہمیں عبرت بھی حاصل کرنا چاہئے کہ ان عظیم الشان عمارات کے تعمیر کرنے والے آج کہاں ہیں؟ اور یہ سب کچھ ان کے کس کام آیا؟

اور پھر سورت کے آخر میں قرآن اپنی عادت کے مطابق اس سارے واقعہ کا پس منظر اور مقصد بیان کرتا ہے۔

لقد کان فی قصصهم عبرة لاولی الباب ماکان حدیثا یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیه وتفصیل کل شی وهدی ورحمه لقوم یومنونo

''ان کے قصے میں بے شک عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ یہ (قرآن) ایسی بات نہیں جو (از خود) بنائی گئی ہو۔ بلکہ جو کتب اس سے قبل نازل ہوئیں، ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے والا ہے اور مومنوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔'' (یوسف:111)

عقل مندوں کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ قصہ یوسف میں جھانک کر دیکھو تم کس جانب ہو؟ حضرت یوسف کی طرف یا برادران یوسف کی طرف؟ اس بھول میں مت رہنا کہ زندگی تو گزارو برادران یوسف کے رنگ ڈھنگ سے اور انجام پاجاؤ حضرت یوسف علیہ السلام کا۔ یہ سنت الٰہی کے خلاف ہے۔ قریش مکہ کا سارا طور طریقہ برادران یوسف کا تھا۔ اس طرح انہیں انجام بد سے خبردار کیا گیا ہے۔

اخلاق حسنہ

اخلاق ۔خُلق کی جمع ہے اورخُلق سے مراد خوب سیرت ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کودو صورتوں پرتخلیق کیاہے۔ایک ظاہرصورت اوردوسری باطنی صورت ہے۔ظاہری صورت کاتعلق انسانی جسم وجاں جبکہ باطنی صورت کاتعلق روح اوردل سے ہے۔روح کی بالیدگی اوردل کی پاکیزگی کانام ہی سیرت ہے۔

انسان صبح سے شام اورشام سے صبح تک کچھ نہ کچھ کرتا رہتاہے۔اس کے سارے کام جووہ سرانجام دیتاہے یاتواچھے ہونگے یابرے۔لہٰذااس کے سارے اچھے کام خوش اخلاقی میں شمار ہونگے جبکہ برے کام بداخلاقی میں گنے جائیں گے۔اخلاق کاوجودتویقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اوراس کے ذہنی وجسمانی اعمال کاوجود ہے۔دنیا کا کوئی بھی مذہب جواخلاق کاماخذ خداکے حکم کے سواکسی اورشئے کوتسلیم کرتاہو۔لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کووحی کے الفاظ میں بیان کیاہے اوراپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی کررکھاہے تاکہ فطرت اگرکسی سبب سے خاموش رہےتواحکام الٰہی کی آوازاس کوپکار کرہشیار کردے۔ہوسکتاہے کہ ہمارے اخلاق کاماخذ خدا کاحکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذاورمحرکات،ضمیر،فطرت،وجداں اورعقل بھی ہوں۔یہ بھی ہوسکتاہے کہ انسان بغیرکسی ذاتی غرض وغایت کوخیال میں لائے محض اپنی فطرت کے اصرارپریاضمیر کی پکار سے مجبورہوکرایک کام کوانجام دے یااپنافرض سمجھ کراس کوپوراکرے یااس کے ساتھ کسی مصلحت عام کی افادیت بھی اس میں شامل ہواوروہ روحانی تکمیل کابھی ذریعہ ہو۔اسلامی اخلاق فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمعے ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے ایک مظلوم کی امدادخدا کاحکم بھی ہے اورہماری فطرت کے اندربھی یہ ودیعت ہے۔ہمارے ضمیر کابھی یہی تقاضہ ہےاوروجدان بھی اس طرح اس کام کواچھا کہتاہے جس طرح

وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے ساتھ ہی اس کے اندر عام فوائد اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہمیں اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہوسکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو تو ایسی عقل کی اصلاح ضروری ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ اس کی خوبی علم وفلسفہ میں نہیں بلکہ عمل میں ہے اس لئے ''علم بلا عمل'' کی کوئی قدر و قیمت نہیں، لیکن اس کے ساتھ ''عمل بلا علم'' کو بھی اخلاق حسنہ میں پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے ان دونوں میں جس قدر باہمی مطابقت وموافقت زیادہ ہوگی اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک اس میں کمی ہوگی اس حد تک اس کے کمال میں کمی ہوگی۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں یا ہو گزرے ہیں سب نے اپنے ماننے والوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دی ہے اور ان مذاہب کے رہنماؤں نے عملی طور پر اخلاق حسنہ کے احکامات اپنے ماننے والوں کو بتائے ہیں۔ انسانی ترقی اور خوشحالی کیلئے بھی اخلاق حسنہ کا ہونا ایک ضروری امر ہے اس کے بغیر کوئی ملک اور کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی اور نہ ہی دوسری قوموں کی امامت وسعادت نصیب ہوسکتی ہے اس وقت جو ملک اور جو قوم عروج کی منزلوں پر فائز ہیں وہ سب اپنے حسن اخلاق کے سبب ان منزلوں تک پہنچے ہیں۔

مذہب اسلام اور ہادی اسلام کی تعلیم اگر چہ ان تمام مذاہب سے زیادہ اس طرف توجہ اور زور دیتی ہے تاہم ہمارے اعمال کی کمزوری اور ہادی اسلام کی تعلیمات سے دوری کیوجہ سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

اخلاق تو بردباری، صبر وتحمل، نیکی، بھائی چارے، اتفاق واتحاد، خوش اخلاقی، شرم وحیا، عزت

وتکریم، حوصلہ اور جرات کا سبق دیتا ہے جبکہ ہمارے ہادی ومرشد، آقا ومولا، شفیع روزجزا قائم الانبیاءؐ اپنی عملی زندگی سے امت مسلمہ کو اس کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف دونوں جہاں کا مالک رب کائنات آپؐ کو اتنے بڑے لقب سے ''جو نہ آپؐ سے پہلے کسی کو ملا اور نہ بعد میں ملے گا'' پکار کر کہتے ہیں **وانك لعلى خلق عظيم** ۔بیشک آپ کو اعلیٰ درجے کے اخلاق پر فائز کیا گیا ہے۔ آپ کا یہ خلق عظیم مکہ کے بداخلاق سرداروں، اسلام کے دشمنوں کیلئے وارننگ تھی کہ اے آنکھوں کے اندھو کانوں کے بہرو زرا سوچو اور غور کرو کہ کبھی دیوانوں اور مجنوؤں کے بھی ایسے اعلیٰ اخلاق ہوتے ہیں۔ یہ بھی آپؐ کے خلق عظیم کا نتیجہ ہی تو تھا کہ مکہ بلکہ پورے عرب کے وحشی اور جاہل تہذیب وتمدن کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر قوموں کے رہبر اور رہنما بن کر اسلام کے پھیلانے میں معاون اور مددگار ثابت ہوئے۔لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ہم نے اس خلق عظیم سے کیا تعلیم حاصل کی اور کیا سبق سیکھا؟ اور کہاں تک اپنے اخلاق کی درستگی کی۔ ہم تو آج بھی اُسی بداخلاقی اور بدگمانی کے دھانے پر کھڑے قسمت کا رونا روتے ہیں۔ کیا کبھی اخلاق رزیلہ سے بھی قسمتیں بدلتی ہیں کیا کبھی برائیوں، قتل و غارت سے قومیں ترقیاں کرسکتی ہیں۔ کیا نبیؐ کے خلق عظیم کو چھوڑ کر بھی عزت وتکریم حاصل ہوسکتی ہے۔نہیں۔کبھی بھی ایسا نہیں ہوسکتا۔

بانی سلسلہ عالیہ تو حیدیہ جناب عبدالحکیم انصاریؒ اپنی کتاب تعمیر ملت کے اخلاقی باب میں لکھتے ہیں کہ انسان کے تمام افعال تین حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

1۔ وہ فعل جن میں اِس کا واسطہ صرف اللہ سے ہوتا ہے۔ یہ حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔

2۔ وہ فعل جو اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتے ہیں ان کو حقوق ذاتی یا حقوق نفسی کہتے ہیں۔

3۔ وہ فعل جو اِس کی اپنی ذات اور مخلوق کے دوسرے فرد یا افراد سے متعلق ہوتے ہیں ان کو معاملات کہا جاتا ہے۔ ان حقوق کو انسان جس طریقے اور نہج سے ادا کرتا ہے اِس کا نام

اخلاق ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی اپنے کسی حق کو نرمی، خوش اسلوبی اور بخوشی خاطر ادا کرتا ہے تو یہ اخلاق حسنہ یا خوش خلقی کہلائے گا اور آدمی کو خوش خلق کہیں گے۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنے حقوق ادا تو کرے مگر سختی، درشتی، بدسلوکی، کراہت یا لیت و لعل سے ادا کرے تو اِس طریقہ کو بداخلاقی اور ایسے آدمی کو بداخلاق کہا جائے گا۔ ہر قوم اور ہر مذہب میں ان حقوق سہ گانہ کو بجالانے کا ایک دستور ہوتا ہے۔ جس قوم کی اکثریت اپنے دستور پر جس قدر ہم آہنگی، یکسانیت اور سرگرمی سے عمل پیرا ہوگی اِسی قدر وہ قوم آرام و آسائش، راحت اور عزت سے زندگی گذار سکتی ہے۔ چونکہ ہر قوم کی طاقت اور قوت اِس کے دستور کی ساخت پر منحصر ہوتی ہے اور جس قدر یہ دستور کسی قوم کے ذہنی و جسمانی تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے اِسی قدر وہ قوم طاقتور اور خوشحال ہوتی ہے۔ ملت اسلام کا دستور ''قرآن'' ہے جو الہامی کتاب ہے۔ انسان کی فطرت، طبیعت اور مقتضیات ذہنی و جسمانی کو جس قدر انسان کا بنانے والا سمجھ سکتا ہے خود انسان بھی ہرگز نہیں سمجھ سکتا اس لئے ہمارا یہ دستور دنیا کا سب سے اعلیٰ، مکمل اور بے نقص دستور ہے۔ لیکن ہم پوری طرح اس پر عمل نہیں کرتے جس کی وجہ سے ہم طرح طرح کے مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ باباجیؒ نے اِس باب میں اخلاق کے اوپر ایک سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے۔ میں بھائیوں سے گذارش کرونگا کہ وہ تعمیر ملت کا مطالعہ ضرور کیا کریں۔ آخر میں باباجیؒ نے اخلاق کا خلاصہ اِس طرح لکھا ہے کہ تمام علم و تربیت فعل و کمال، زُہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت اور ہدایت و معرفت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آدمی حسن اخلاق کا پتلا اور رحم و کرم کا مجسمہ ہو۔ جب تک یہ نہ ہوگا کتنی ہی نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں، زکوٰۃ دیں، خیرات بانٹیں۔ ملت اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کر سکتی اِس لئے ضروری ہے کہ عبادات کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان حسن اخلاق یا اخلاق کامل پیدا کرنے کو اپنے اوپر لازم قرار دے۔

چونکہ حسن خلق اللہ کی پسندیدہ خصلتوں میں سے ایک خصلت ہے جس سے انسان کو جسمانی

اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا ہے جو ہمارے ازلی دشمن ابلیس کو ہرگز پسند نہیں وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی بداخلاقیوں کی وجہ سے جسمانی اور روحانی کرب میں مبتلا رہے لہذا کئی لوگ اِس کے جال میں پھنس کر بداخلاقی کے راستے اختیار کر لیتے ہیں۔

امام غزالیؒ خطبات غزالی میں لکھتے ہیں کہ خَلق سے مراد صورت ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورت باطنی ہے۔انسان جس طرح جسم سے ترکیب دیا گیا ہے۔ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ وغیرہ اس کو مرحمت ہوئے ہیں جن کو قوتِ بصارت یعنی آنکھیں ادراک کر سکتی ہیں۔اِسی طرح انسان روح اور نفس سے ترکیب دیا گیا ہے۔اِس کا ادراک صرف بصیرت کی آنکھیں کرتی ہیں ظاہری آنکھ سے یہ نظر نہیں آتی ۔علامہ اقبالؒ اِس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

چشم بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

ان دونوں ترکیبوں میں اللہ عزوجل نے اپنی مخلوق کو جدا جدا صورتوں اور قسم قسم کی شکلوں میں پیدا فرمایا ہے۔کوئی صورت و سیرت حسین اور اچھی ہے اور کوئی بری اور بھونڈی ہے۔ظاہر شکل و ہیت کو صورت اور باطنی شکل و ہیت کو سیرت کہتے ہیں، سیرت کا رُتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ اللہ عزوجل نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے ۔ثابت ہوا کہ زیادہ قابل لحاظ سیرتِ انسان ہی ہے کہ جب تک اِس باطنی ترکیب کی شکل و ہیت میں حسن موجود نہ ہوگا اِس وقت تک انسان کو خوبصورت اور حسن اخلاق کا مالک نہیں کہا جاسکتا۔

خالق کی خوشنودی اور مخلوق میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کیلئے اخلاق سب سے بڑا سب سے بہتر اور سب سے آسان ذریعہ ہے۔انسان کتنا ہی عالم فاضل ہو، عابد و زاہد ہو، متقی و پرہیز گار ہو اگر اوصافِ اخلاق سے محروم ہے تو اِس کا علم و فضیلت، زُہد و تقویٰ سب بے کار ہیں۔ شارع السلام حضرت نبی کریم ﷺ نے اخلاق کی تعلیم پر جس قدر زور دیا اِس کے مطالعہ کے بعد

یہ دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اسلام کی تمام تر تعلیم کا لبِ لُباب صرف اخلاق ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے تین بار یہی ایک سوال کیا کہ دین کیا ہے۔ آپؐ نے تینوں مرتبہ یہی جواب دیا کہ "اخلاق" آپ کا ارشادِ مبارک ہے کہ خوئے بد (بد اخلاقی) عبادات کو اِس طرح تباہ اور رذائل کر دیتی ہے جیسے سرکہ شہد کو۔

انسانی طبعی طور پر نورانی بھی ہے ظلماتی بھی۔ زمینی بھی ہے آسمانی بھی، ملکوتی بھی ہے ناسوتی بھی۔ رحمانی بھی ہے شیطانی بھی، عالم بھی ہے جاہل بھی، ظالم بھی ہے عادل بھی، صبور و شکور بھی ہے، شرور و کفور بھی غرضیکہ صفاتِ کریمہ و ذمیمہ اِس کی سرشت میں موجود ہیں۔ اور اس کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ اِن میں سے جس پر چاہے عمل پیرا ہو۔ اللہ تعالیٰ سورہ دہر آیت نمبر دو اور تین میں فرماتے ہیں۔ ترجمہ! ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پھر کر دیا اس کو سننے والا اور دیکھنے والا۔ پھر ہم نے اُسے راستہ کی ہدایت دی۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ شکر گزار بندہ بنتا ہے یا ناشکر گذار۔ اِس کے بارے میں علامہؒ یوں فرماتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کائنات میں سب سے خوب سیرت تو سرورِ عالم رسول مقبولؐ ہیں آپؐ کے بعد جس مسلمان کو آپؐ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہوگی اِسی قدر اِس کو حسین سیرت کہیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ سیرت باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہوگا اسی قدر اس کو سعادت اُخروی نصیب ہوگی۔ کامل درجے کا شخص معشوق اور محبوب بن جاتا ہے جبکہ پرلے درجے کا قبیح و بد باطن شخص کمال بغض و نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ درمیانی حالت میں محبت اور نفرت کے ہزار ہا درجے نکلتے ہیں جن پر ان کی مقدار و کیفیت کی مناسبت سے ثمرات و نتائج ملتے ہیں۔ درمیانی حالت کا مشاہدہ ایک مشکل امر ہے کیونکہ انسان کو اپنے نفس کی حالت معلوم کرنے میں اکثر دھوکہ

ہو جاتا ہے بد اخلاق شخص بھی کبھی اپنے آپ کو خلیق اور خوب سیرت سمجھنے لگتا ہے اور نفس اِس عیب کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔لہٰذا کسی مخلص اور صاف گو دوست سے اپنے اخلاق کے بارے میں پوچھ لینا ضروری ہے۔پس اگر دوست کو آپ کی خیر خواہی ملحوظ ہوگی تو وہ بے تکلف آپ کی کمزوری پر آپکو مطلع کر دے گا اِس طرح اصلاح کی صورت نکل آئے گی۔

آخر میں خلق عظیم کے بارے میں صحابہؓ کے چند قول ملاحظہ فرمائیں۔

1) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خلق عظیم سے مراد دین عظیم ہے کہ اللہ کے نزدیک اِس دین اسلام سے زیادہ محبوب کوئی اور دین نہیں۔

2) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ ؐ کا خلق خود قرآن ہے یعنی قرآن کریم جن اعلیٰ اعمال اور اخلاق کی تعلیم دیتا آپؐ اُن سب کا عملی نمونہ ہیں۔

3) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی اِس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا۔اور جو کام نہیں کیا اس پر یہ نہ فرمایا کہ ایسا کیوں نہیں کیا۔

4) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی کو نہیں مارا اگر کبھی کسی سے کوئی خطاء یا لغزش بھی ہوئی تو کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

5) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی سائل کو محروم نہیں کیا۔

6) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن اخلاق کی بدولت اُس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا ہے اور دن کو روزہ رکھتا ہے۔دُعا ہے کہ اللہ کریم ہم سب کو اخلاق حسنہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔"آمین"

روحانی علم

(پروفیسر شبیر شاہد ہوتوانی)

علم ایک ایسا پھول ہے جتنا زیادہ کھلتا ہے اتنا زیادہ اس کی خوشبو پھیلتی ہے۔

علم ایک ایسا گوہر ہے جس کی تابناکی اظہر من الشمس ہے۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جس کو جتنا خرچ کیا جائے اتنا بڑھتا ہے۔ یہاں علم کی اہمیت کو اُجاگر کرنا مقصود نہیں بلکہ علم کی اس طرح وضاحت کرنا ہے کہ کونسا علم نافع ہے اور کونسا مضر۔

علم مفید اور نافع وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی ذات وصفات کا اظہار ہو اور جس سے اس کی بندگی کی کیفیت کا پتہ چلے۔ اس علم کی مثال شمع کی سی ہے کہ جب وہ کسی بندہ کے دل میں ڈالا جاتا ہے تو اس کے شعاعوں اور انوار سے اس بندہ کا دل لبریز ہو جاتا ہے اور تمام شکوک و شبہات اور وہم خواہ دین کے یا دنیا کے ہوں زائل ہو جاتے ہیں اور ہر معاملہ میں یقین اور حقیقت وسچائی کے دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ شہوت و کدورت کی تاریکی اس کے دل ودماغ سے دور ہو جاتی ہے۔ درحقیقت علم یہی ہے جس علم کی یہ شان اور تاثیر نہ ہو وہ علم ہی نہیں، وہ محض زبانی علم ہے بلکہ گمراہی ہے۔

عمدہ اور نافع علم وہ ہے جس کے ساتھ خوفِ خدا بھی ہو اس کے علاوہ رب ذوالجلال کی عظمت وجلال بھی دل میں ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے ایسے علم والوں کی تعریف کی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ **انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلما ء** یعنی اللہ تعالیٰ جل جلالہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔

پس جس علم سے بندہ میں خشیت یعنی خوفِ خدا نہ ہو وہ علم نہیں اور نہ وہ شخص عالم حق ہے۔ عالم کی علامت خوفِ خدا ہے اور خوفِ خدا کی علامت شریعت کی اِتباع ہے۔ اگر شریعت کی اتباع نہیں اور جس علم کے ساتھ دنیا کی رغبت ہو، مال کمانے کی طرف توجہ ہو دنیاداروں کی خوشامد ہو، دل میں تکبر اور بڑی بڑی تمنائیں اور آرزوئیں ہوں اور آخرت سے قطعی غفلت ہو، ایسا علم، علم نہیں جہالت ہے۔ وہ علم جو منعمِ حقیقی سے دور لے جانے کا باعث ہو اسے جہالت ہی کہا جائے

گا۔علم نافع وہی ہوتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں نفع بخش ہو۔علماءِ حق اور علماءِ دنیا میں بنیادی فرق یہی ہے کیونکہ علمائے دنیا خدا تعالیٰ جل جلالہ سے نڈر اور اپنے علم پر مغرور و متکبر ہوتے ہیں۔

جب آدمی میں اتنا شعور اُجاگر ہو جاتا ہے کہ کونسا علم نافع ہے اور کونسا مضر،تو پھر اس کی سوچ کا زاویہ مثبت رُخ اختیار کر لیتا ہے، منفی سوچیں اور رویے دل و دماغ سے نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔پھر وہ ایک راہ مستقیم کے تعین کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے اور وہ اپنا محاسبہ کرتا ہے کہ میں کونسی ڈگر اور پگڈنڈی پر رواں ہوں کیا میری سوچ مذکورہ مثبت خیالات کے برعکس تو نہیں۔جب یہ سوچ ذہن میں جگہ بنا لیتی ہے تو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی خیال اُسے جادہ حق پر چلنے کیلئے راہ ہموار کر دیتا ہے۔یہاں تک وہ تہیہ کر لیتا ہے کہ قلب و دل کو کس طرح منور کر کے علم سے کما حقہ مستفید ہو سکتا ہوں۔اس کے بعد رجوع اِلی اللہ کا مرحلہ آ جاتا ہے اپنی گزشتہ زندگی پر نادم ہوتا ہے جس میں ہر لمحہ دنیا سے محبت اور گناہوں کی دلدل میں پھنسا رہتا تھا پھر انقلاب آفریں میں سوچ کے ساتھ اللہ والوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے اور اپنے اندر وہ اغیار کے نقشوں کو مٹا کر صرف اللہ تعالیٰ اور حضور اکرم ﷺ سے محبت کو بڑھانا چاہتا ہے۔اگرچہ وقتی نیک جذبہ اسے فوری طور پر بُری ڈگر سے نیک راہ پر لانے کیلئے کافی نہیں ہوتا کیونکہ اس نے پچھلی ساری زندگی گناہوں اور نافرمانی میں گزاری ہوتی ہے اس کے اثرات فوری زائل ہونے کا نام نہیں لیتے۔حالانکہ وہ اب بھی شہوات نفسانیہ کی قید میں مقید ہوتا ہے۔اس کے دوست ساتھی اس کیلئے رکاوٹ کا باعث بنیں گے اس کا نفس اُسے نیک راہ پر گامزن ہونے میں رکاوٹ ڈالے گا۔ یہاں تک کہ اسے فوری طور پر رکاوٹوں کے پہاڑ کھڑے نظر آئیں گے۔بہر حال نافرمانی اور گناہوں کے بار بار کرنے سے اُکتاہٹ اُسے مجبور کر کے نیک راہ پر لا دیتی ہے۔اب اُسے رب سے پہلے اس آلودہ ماحول کو خیر باد کہنا ہوگا۔یہ عزم صمیم اُس کے لئے ایک بہت بڑی ڈھارس ثابت ہوگا۔اغیار موجودات کی صورتیں اُس کے آئینہ دل میں منقش ہوں اور ذاتِ باری تعالیٰ سے محبت کی سوچ بھی ہو،ایسی حالت میں منزل تک رسائی ناممکن ہے غالباً حدیث قدسی ہے جس کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نہ آسمانوں اور زمینوں میں سما سکتا ہوں البتہ مومن

کے دل میں سما جاتا ہوں ۔اس حدیث مبارکہ میں مومن کے دل میں سمانے کا فرمایا گیا ہے کسی انسان، مسلمان کے دل کا نہیں فرمایا، مومن کے دل میں کوئی غیر اللہ نہیں ہوتا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت ہوتی ہے ۔اِس وجہ سے اس شخص کو سب سے پہلے یہ سوچنا ہے کہ میں اس دل کے نہاں خانے کو تمام منفی سوچوں اورآ لائشوں سے پاک کروں ورنہ خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں داخل ہونے کی کیونکر طمع کرسکتا ہے اور وہ اپنی غفلتوں کی ناپاکی سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوا اور اپنی نا زیبا حرکات سے باز نہیں آیا۔دل کا محل پاک صاف ہوگا تو اس ذات بابرکات کو اس میں بٹھایا جا سکتا ہے۔

دل کے آئینہ میں دنیا اور دنیا کی چیزیں مال، دولت، آبرو، اولاد، جائیداد، خیالات اور بے ہودہ آرزوئیں اور باطل تمنائیں گھسی ہوئی ہوں تو ایسا دل کیسے صاف اور روشن ہوسکتا ہے۔جب ان چیزوں کی تاریکی دل سے دور ہوگی تو اس وقت نورِ الٰہی کا گذر ہوگا۔نفسانی وشہوانی خواہشات کی قید سے گھرا شخص شب و روز اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے کہ یہ شے کھاؤں، فلاں لباس پہنوں، فلاح عورت سے نکاح کروں اور فلاں چیز خریدلوں ۔ایسے دل والا شخص دنیا کا طالب تو ہو سکتا ہے وہ خدا تعالیٰ جل جلالہ کی طرف کیسے چل سکتا ہے۔جیسے ایک ناپاک آدمی مسجد میں نہیں آ سکتا ایسے ہی غفلت کی ناپاکی سے جو دل ابھی تک پاک نہ ہوا وہ کیسے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں داخل ہوسکتا ہے۔

ہاں اگر اس نے اس پاک وادی میں قدم رکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے تو اب اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی رحمت شامل حال ہوجائے گی اور مثبت راہیں بھی ہموار ہونا شروع ہو جائیں گے۔اس طرح اللہ پاک اس کے کبیرہ اور صغیرہ گناہ معاف فرما دے گا۔یہ بات الگ ہے کہ عدل و انصاف پر آئے تو کوئی گناہ صغیرہ نہیں صغیرہ بھی کبیرہ اور کبیرہ بھی کبیرہ۔کیونکہ رب تعالیٰ کی نافرمانی تو بہت بڑا گناہ ہے لیکن اس کی رحمت بے پایاں ہونے کے ناطے صغیرہ اور کبیرہ کی تخصیص کی گئی ہے تا کہ کوئی مایوس نہ ہوجائے۔

حق تعالیٰ کی صفت عدل و انصاف کا اگر عالم میں ظہور اور ہمارے ساتھ انصاف و عدل کا

معاملہ ہوتو ادنیٰ گناہ بھی صغیرہ نہیں بلکہ سب کے سب گناہ کبیرہ اور قابل گرفت ہیں اس لئے کہ ایسے بڑے محسن کی جس کے احسانات بے شمار ہیں۔ادنیٰ نافرمانی بھی اس درجہ سخت ہے کہ ہلاک کردینے کیلئے کافی ہے اور اگر اس کے فضل و کرم کی صفت ظاہر ہو اور ہمارے ساتھ فضل کا معاملہ ہو تو بڑے سے بڑا گناہ بھی کبیرہ نہیں۔

عدل کریں تے تھر تھر کنبن اُچیاں شاناں والے ہو
فضل کریں تے بخشے جاون میں جیہے منہ کالے ہو

اِسی بات کو ایک اور شاعر نے یوں لکھا ہے۔

خطائیں دیکھتا بھی ہے عطائیں کم نہیں کرتا
سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ اتنا مہربان کیوں ہے

یہ بات لازم ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، گناہ صادر ہو جاتے ہیں لیکن پروردگار کے ساتھ حصول استقامت سے مایوس نہ کردے کیونکہ شاید یہ آخری گناہ ہو جو مقدر ہوا ہے۔گناہ کے صادر ہونے پر دین پر پختگی میں فرق نہ آئے اور یہ سمجھ کر اور گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے کہ گناہوں سے بچنا میرے بس کا روگ نہیں لہٰذا توبہ توڑ بیٹھے۔گناہ کا از راہِ بشریت صادر ہونا دین پر پختگی کے خلاف نہیں ہاں گناہ پر اصرار کرنا اور توبہ نہ کرنا اور دوسری مرتبہ اس کے کرنے کا قصد کرنا دین پر پختگی کے خلاف ہے۔طاعت و عبادات کے فوت ہونے پر غم نہ کرنا اور معاصی و سیّات (گناہوں) کے واقع ہونے پر پشیمانی کا نہ ہونا نہایت خطرناک ہے۔بدن کی زندگی کا دارومدار غذا و خوراک پر ہے اسی طرح روح یا دل کی زندگی ایمان اور عمل صالح (نیکی) سے ہے۔

کوئی گناہ خیال میں اتنا بڑا نہ ہونا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے ساتھ حسن ظن سے روک دے اور اس کی رحمت و فضل و عنایت سے مایوس کردے کیونکہ جس نے اپنے پروردگار کو پہچانا اس نے بمقابلہ اس کے کرم و فضل کے اپنے گناہ کو کم اور حقیر جانا۔یعنی یہ خیال پیدا ہو جائے کہ میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ اب اس کی مغفرت نہ ہوگی اور اب میں اس گناہ سے اس درجہ پر پہنچ گیا کہ

رحمت وفضل کی مجھ میں قابلیت نہیں رہی۔اللہ تعالیٰ جل شانہ کے فضل وعنایت کی صفت کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو حقیر اور لاشئی جانے اور معافی اور مغفرت کی اُمید رکھے۔ہاں البتہ دل میں اس گناہ کو اتنا ہلکا بھی خیال نہ کرے کہ توبہ کرنے کی توفیق ہی نہ ہو۔

لمحہ فکریہ!

زندگی ایک ناؤ کی طرح ہے جو ظلمت و گہرائی کے سمندر (دُنیا) میں رواں دواں ہے۔یہ مختلف خطرات (حالات وواقعات و برائیوں) سے گھری ہوئی ہے۔ہوا کے تھپیڑے (شیطان کے حملے) متواتر لگ رہے ہیں۔سمندر کی طغیانیاں (یعنی نفس کی خواہشات) اس کیلئے خطرہ ہیں۔اس مدو جزر میں پھنس گئی تو نکلنا مشکل، کیونکہ اس مدو جزر میں ہمہ وقت ڈانوں ڈول رہتی ہے۔اِس موقع پر چپوؤں (نیک اعمال) کا چلنا جاری رہے تا کہ ان طغیانیوں سے بچا جا سکے۔ پتوار کا رُخ ٹھیک (نیت صاف خلوص بھری) ہو تو منزل (اللہ تعالیٰ) قریب ہے اگر رُخ غلط سمت (دنیا کی طرف) ہوا تو بھول بھلیاں اس کا مقدر ہیں۔اس کشتی کے ملاح (قلب و روح) کو ہلکی غذا (ذکرواذکار، یادالٰہی) میسر ہو تو یہ صحت مند اگر کثیف غذا (گناہ، نافرمانیاں) تو ملاح (قلب و روح) بیمار پڑ جائے گا۔صحت کی حالت میں کشتی (زندگی) کو خوب کھیلے گا۔ بیماری کی حالت میں کشتی کا چلنا (زندگی) خراب اور منزل (اللہ تعالیٰ) دور۔

یاد رکھیئے! اگر کشتی (زندگی) کو صحیح سالم حالت میں منزل مقصود (اللہ تعالیٰ) تک پہنچانا ہے تو ہوا کے تھپیڑوں (شیطان)، سمندر کی طغیانیوں (نفس کی خواہشات) سے بچیں۔چپوؤں (نیک اعمال) کو چلاتے رہیں۔پتوار کا رُخ صحیح سمت (توحید و درست ایمان وعقیدہ) میں رکھیں۔ملاح (قلب و روح) کو متوازن غذا (ذکرواذکار) دیں تو پھر منزل مقصود (اللہ تعالیٰ کی محبت) آپ نے پالی۔

رسول اکرم ﷺ کے مؤذن

جب حضرت بلال بن رباحؓ کے ایمان کی خبران کے آقا امیہ بن خلف کو لگی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا اور اس نے اپنے غلام بلال کو طرح طرح کی سخت سے سخت سزائیں دینی شروع کیں۔ مکہ کی گرم تپتی زمین پر انہیں چت لٹا کر ان کے بدن پر بھاری پتھر رکھ دیتا یا ان کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر مکہ کے اوباش بچوں اور لوگوں کی نذر کر دیتا کہ جی بھر کر ان کو گھسیٹیں اور پٹائی کریں جب تک کہ ان کی زبان سے کلمہ کفر نہ نکل جائے۔ لیکن کمال پختہ ایمان تھا حضرت بلالؓ کا! ہر پہنچنے والی تکلیف پر ان کی زبان سے احد احد (اللہ ایک ہے اللہ ایک ہے) کا نعرہ نکلتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گزر حضرت بلالؓ کے پاس سے ہوا جن کو سخت سزائیں دی جا رہی تھیں۔ آپ نے حضرت بلال کے مشرک آقا امیہ بن خلف سے کہا: اے امیہ! میں تجھ سے اس غلام کو خریدنا چاہتا ہوں۔

اُمیہ بن خلف نے کہا:

''اس کو لے جاؤ اگر چہ دس دینار کے عوض ہی کیوں نہ ہو۔''

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر تم اس کی قیمت ایک لاکھ دینار بھی کہتے تو میں اسے خرید لیتا۔''

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت بلالؓ کو خرید لیا اور اسی وقت ان کے لیے آزادی کا پروانہ جاری کر دیا۔

اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

''اور اس (شعلے مارتی ہوئی آگ) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیز گار ہے، جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے، کسی کا اس پر کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو۔ بلکہ وہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا و خوشنودی چاہتا ہے،

اور یقیناً وہ (اللہ بھی) عنقریب راضی ہو جائے گا۔ (اللیل: ۹۲/۱۷-۲۱)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بغیر کسی عوض اور شکرانے کی خواہش کے حضرت بلالؓ کو آزاد کر دیا

اوران کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔اور حضرت بلالؓ کی حالت یہ تھی کہ ان کے کپڑے پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہو چکے تھے، سخت پٹائی کی وجہ سے خون ٹپک رہا تھا اوران کے جسم سے گوشت کے لوتھڑے گر رہے تھے۔

نبی کریم ﷺ کی نگاہ جونہی حضرت بلالؓ پر پڑی فوراً اٹھے اور ان کو اپنے سینے سے لگالیا جیسے ایک ماں اپنے لخت جگر کو اپنی چھاتی سے لگاتی ہے۔پھر آپ نے ان کے لیے دعائیں کیں اور انہیں اپنا مؤذن بنالیا،اور اسلام کے سب سے پہلے مؤذن کی حیثیت سے ان کا نام تاریخ اسلام میں ثبت ہوگیا۔

جب جب نماز کا وقت آن پہنچتا،اذان بلالی کی پرزور پرتاثیر آواز خاموش فضا میں گونجتی ہوئی باشندگان مدینہ کے کانوں میں جا پہنچتی:(اللہ اکبر اللہ اکبر،اللہ اکبر اللہ اکبر)اور یہ سنتے ہی مسلمانوں کے جسم میں شوق بارگاہ الٰہی کے باعث جھنجھناہٹ اور کپکپی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

رسول اکرم ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی تھی حدیث میں ہے کہ آپ حضرت بلالؓ کو آواز دے کر فرماتے:

''اے بلال!ہمیں نماز کے ذریعے سے آرام بہم پہنچاؤ۔''

چنانچہ حضرت بلالؓ کھڑے ہوتے اوراپنی حسین وسریلی آواز میں اذان پکارتے۔

حضرت بلالؓ کا معمول تھا کہ وہ وضو کا پانی اور چھڑی لے کر رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کا جوتا اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے رہتے۔جب رسول اکرم ﷺ وضو سے فارغ ہوجاتے تو چھڑی اور جوتا ان سے لے لیتے۔حضرت بلالؓ اس کام کو بہت ہی بڑا شرف سمجھتے تھے کہ ایسا شرف کسی کو بھی حاصل نہیں۔

نبی کریم ﷺ کی محبت والفت اس قدر ان کے قلب وجگر میں جاگزیں تھی کہ ہر پل اور ہر لمحہ یہی فکر ان کو دامن گیر ہوتی کہ کسی طرح اپنے محبوب کے ہر ہر عمل کو اپنا معمول بنالیں۔نبی کریم ﷺ سے محبت والفت کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور شاعر کا یہ شعر ان کی زبان

سے نکل رہا تھا

ترجمہ: ''میں تم سے محبت کرتا ہوں، مت پوچھو کہ کیوں، میں دل وجان سے
زیادہ تم سے محبت کرتا ہوں، دراصل یہ محبت میرا عقیدہ ہے اور
یہی میرا مذہب بھی!

ایک روز نبی کریم ﷺ نے حضرت بلالؓ سے دریافت فرمایا:
''اے بلال! مجھے اپنے اس عمل کے متعلق بتاؤ جسے تم نے اسلام
میں کیا ہو اور جس (کی مقبولیت) کی تمہیں زیادہ امید ہو، کیونکہ
میں نے جنت میں تمہارے جوتوں کی چاپ اپنے آگے سنی ہے؟''

اللہ اکبر! بھلا اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک انسان کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں چلتا پھرتا جنتی ہے؟!!

حضرت بلالؓ نے اپنے حبیب کا جواب دیتے ہوئے عرض کیا:
''میں نے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی (قبولیت کی) مجھے زیادہ
امید ہو، ہاں رات یا دن کے کسی بھی وقت جب میں وضو کرتا ہوں
تو جس قدر نماز میرے مقدر میں ہوتی ہے، پڑھ لیا کرتا ہوں۔''

ایک غزوے میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو لشکر اسلامی کی نگرانی سونپی اور فرمایا:
''ہمیں نماز فجر کے لیے کون بیدار کرے گا؟''

حضرت بلالؓ نے عرض کیا: ''میں بیدار کروں گا اے اللہ کے رسول!''

اس کے بعد لشکر اسلامی آغوش نیند میں چلا گیا اور حضرت بلالؓ رات بھر نماز میں گزارنے کی نیت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھنے لگے۔ مگر فجر سے تھوڑا سا پہلے ان کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ تھوڑا سا لیٹ کر آرام کر لیا جائے، چنانچہ ان کے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ نماز فجر کا وقت ہوا تو رسول اکرم ﷺ کی آنکھ کھلی۔ ادھر لشکر بھی نیند سے سو رہا تھا اور ادھر بلالؓ بھی آغوش نیند میں خراٹے لے رہے تھے حتیٰ کہ سورج طلوع ہو گیا۔ طلوع آفتاب کے بعد سب سے پہلے جن کی

آنکھ کھلی وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے، پھر حضرت عمر بن خطابؓ کی آنکھ کھلی تو انہیں یہ المیہ نظر آیا جو پہلی دفعہ رونما ہوا تھا اور اس حادثے میں حکمت پنہاں تھی کہ اگر کسی شخص کی آنکھ طلوع آفتاب تک نہ کھل سکے اور اس پر نیند غالب رہے تو وہ معذور ہے (جب آنکھ کھلے گی تب ہی وہ نماز کی ادائیگی کرے گا۔)

حضرت عمر بن خطابؓ نیند سے بیدار ہو کر رسول اکرم ﷺ کے قریب پہنچے، مگر انہیں شرم آئی کہ وہ اپنے عظیم معلم سے کہیں کہ نماز کے لیے بیدار ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ رسول اکرم ﷺ کے پاس جا کر اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا بلند کرنے لگے۔ رسول اکرم ﷺ ان کی آواز سن کر بیدار ہوئے اور اپنے محبوب مؤذن حضرت بلالؓ کو اپنے پاس بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور فرمایا:

''تم نے ہمیں نیند سے بیدار نہیں کیا؟''

حضرت بلالؓ نے عرض کی:

''اللہ کے رسول! میری آنکھوں کو کھلنے سے اس ذات نے روکے رکھا جس نے آپ کو بیدار ہونے سے روکا۔''

یہ سن کر رسول اکرم ﷺ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ پھر طلوع آفتاب کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان دی اور رسول اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

فتح مکہ کے دن رسول اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں اپنے دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ ایک فاتح سپہ سالار کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ان بتوں کو دیکھا جن کی کفار عبادت کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے عصا سے ان بتوں کی طرف اشارہ فرماتے جاتے اور وہ منہ کے بل گرتے چلے جاتے تھے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ قول دہراتے جاتے تھے:

''حق آ چکا اور باطل نابود ہو گیا، یقیناً باطل تھا بھی نابود ہونے والا۔'' (بنی اسرائیل: ۱۸/۱۷)

نماز ظہر کا وقت آن پہنچا اور تمام لوگ کعبہ مشرفہ کے صحن میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرنے لگے، رسول اکرم ﷺ نے پوچھا۔

''بلال کہاں ہے؟''

حضرت بلالؓ نے عرض کی: ''میں حاضر ہوں اے اللہ کے رسول ﷺ!''

ارشاد ہوا:

''کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان پکارو۔''

سبحان اللہ کیا یہ ضعفا کے لیے اچھا بدلہ نہیں ہے؟

کیا یہ مسکینوں اور غریبوں کے ساتھ مکمل انصاف نہیں ہے؟

کیا یہ کمزوروں میں بھی سب سے زیادہ کمزور کی رفعت و بلندی نہیں ہے؟

کیا یہ کمال انصاف نہیں ہے کہ ایک کالا کلوٹا غلام بیت اللہ پر چڑھتا ہے تا کہ اس پر سے حق کی صدا بلند کرے؟

کہاں ہے ابوجہل؟ آگ میں!

کہاں ہے ابولہب؟ آگ میں!

کہاں ہیں کفار قریش آگ میں!

مگر بلال جو انتہائی مفلس و نادار ہیں، ان کے قدموں کی چاپ جنت میں سنائی دیتی ہے!

حضرت بلالؓ کعبہ مشرفہ کی چھت پر حق کی آواز بلند کرنے کے لیے جلوہ افروز ہوئے اور جب انہوں نے اپنی پر تاثیر آواز میں اذان پکاری تو سارے کے سارے لوگ زارو قطار رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کون ہے وہ جس نے اس منظر کے دیدار سے پہلے کے حالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو اور اب کعبہ کی چھت پر مؤذن رسول کی آواز بلند ہونے سے اس کی آنکھیں آنسو نہ بہاتی ہوں؟

جب اذان کی آواز رسول اکرم ﷺ کے کانوں میں پڑی تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نہ تھمنے والی بارش برسنے لگی، کیونکہ آپ کے سامنے دشمنان اسلام کا پچھلا کردار تھا کہ کس کس طرح سے ان ظالموں آپ کے ساتھیوں کے ساتھ دردانگیز رویے اختیار کیے تھے، لیکن اذان بلالی سن کر آپ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ کہ ایک مظلوم غلام، جس

کو مکہ کی گلی گلی میں مارا گیا تھا، پیٹا گیا تھا، گھسیٹا گیا تھا، ذلیل ورسوا کیا گیا تھا، آج خانہ کعبہ کی چھت پر اللہ اکبر کی صدا بلند کر رہا ہے، اور تاریخ اسلامی کا پہلا مؤذن بن چکا ہے۔ جس کی اذان مکہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں گونج اٹھی ہے اور جس سے زلزلے کا سماں پیدا ہو چکا ہے۔

پھر کچھ ہی عرصے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو جاتی ہے۔

حضرت بلالؓ اپنے محبوب کے انتقال کے بعد غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں محبؐ و محبوب نے ایک ساتھ زندگی گزاری تھی، زندگی کے میٹھے اور کڑوے حالات کا دونوں نے ایک ساتھ سامنا کیا تھا، آسان اور مشکل گھڑیاں ایک ساتھ دیکھی تھیں، دن اور رات کی سرگرمیوں مین ایک ساتھ حصہ لیا تھا، اور پھر ایکا یک محبوب کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے تو محبؐ کی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

حضرت بلالؓ کی آنکھوں میں دنیا اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے باوجود ہیچ ہو چکی تھی کیونکہ ان کی نگاہ کا محور صرف محمد ﷺ کی زندگی تھی اور بس!۔۔۔ مگر حضرت بلالؓ نے خود کو سنبھالا اور ہوش میں آئے اور اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "کیا محمد ﷺ واقعی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں؟ کیا اب دنیا میں آپ ﷺ سے ہماری ملاقات نہیں ہو گی؟ ہاں مگر آپ کا دین موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا، اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اذان کی ذمہ داری نبھاتا رہوں۔"

جب صبح ہوئی تو اپنے فیصلے کے مطابق حضرت بلالؓ فجر کی اذان دینے کے لیے بیدار ہوئے اور اذان پکارنے لگے: اللہ اکبر اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر! ایکا یک ان کی نگاہ محراب پر پڑی جو امام سے خالی اور سنسان تھی۔ انہوں نے اپنی نگاہ رسول اکرم ﷺ کے گھر کی طرف دوڑائی لیکن وہ بھی خالی! اب وہ اکیلے ہیں، کوئی امام نہیں، کوئی رسول نہیں، پھر بھلا کیونکر وہ اذان کے اگلے جملے مکمل کریں۔ غرض انہوں نے خود کو سنبھالا اور اپنے نفس پر قابو رکھ کر اذان کا اگلہ جملہ کہا:

لیکن اب آگے کمر توڑنے والی عبارت آ رہی ہے، ایک دشوار گزار مرحلہ آن پہنچا ہے کہ آگے کا ایک جملہ تو کجا، ایک کلمہ کہنا بھی دشوار بلکہ ناممکن سا ہو گیا ہے، بہر حال پکارتے ہیں:

''اشہد ان محمد ۔۔۔۔''

اسی پر آواز بند ہو جاتی ہے، باقی اذان مکمل نہیں ہو پاتی ۔ بلالؓ زور سے رو پڑتے ہیں اور مدینہ کے سارے مسلمان اپنے اپنے گھروں میں آہ و زاری کرنے لگتے ہیں ۔ خواتین الگ رو رہی ہیں، بچے الگ رو رہے ہیں اور بوڑھے الگ آہ وزاری کر رہے ہیں !! ادھر مؤذن کی شدید آہ بکا سے آواز بند ہو جاتی ہے، اذان مکمل نہیں ہو پاتی ۔ چنانچہ اذان کی جگہ سے اتر پڑتے ہیں اور زمین پر پڑ جاتے ہیں ۔

امام کہاں ہیں؟ فوت ہو گئے؟ اور مؤذن زندہ رہ گیا ؟!

صحابہ کرام جلدی سے مسجد نبوی میں حاضر ہوتے ہیں، دیکھتے ہیں تو مؤذن زمین پر پڑے ہیں اور اس طرح زار و قطار رو رہے ہیں جس طرح ماں سے بچھڑا ہوا ایک معصوم بچہ آہ وزاری کرتا ہے ۔

صحابہ کرام پوچھتے ہیں: ''اے بلالؓ آپ کو کیا ہو گیا ؟''

بلال: ''میں اذان نہیں کہہ سکتا۔''

پھر امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لاتے ہیں اور پوچھتے ہیں:

''آپ کو کیا ہو گیا ؟''۔

حضرت بلالؓ فرماتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد اب میں کسی کے لیے اذان نہیں دے سکتا۔''

صحابہ کرام کہتے ہیں:

''سبحان اللہ، پھر کون ہمارے لیے اذان کہے گا ؟''

حضرت بلالؓ فرماتے ہیں ۔

''آپ لوگ اپنے درمیان میں سے کسی کو مؤذن منتخب فرما لیں۔''

چنانچہ خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت بلالؓ کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے ان کی معذرت قبول فرمائی اور اب مؤذن رسول کی آواز سے لوگ محروم ہو گئے !

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں برسوں میں داخل ہوتے رہے اور زندگی کے ایام اپنا سفر بلاانقطاع طے کرتے رہے۔حضرت بلالؓ روحانی وجسمانی حیثیت سے کلمہ لاالہ الا اللہ کی سر بلندی کی خاطر مختلف معرکوں میں شریک ہوتے رہے۔

پھر ایک مرتبہ جہاد فی سبیل اللہ میں نکلے اور مجاہدین کے ساتھ شام جا پہنچے۔اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اسلام کو فلسطین کی مقدس سرزمین پر فتح وکامرانی عنایت فرمائی اور مسلمانوں نے انتہائی جوش وخروش سے بیت المقدس پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

خلیفہ عمر بن خطابؓ مدینہ منورہ سے بیت المقدس کے لیے روانہ ہوئے، آپ کے ہمراہ آپ کا غلام بھی تھا۔کبھی سواری پر خود سوار ہوتے اور کبھی غلام۔یوں باری باری سواری کرتے ہوئے فلسطین کی سرحد میں داخل ہوگئے اور آپ کی حالت یہ تھی کہ جسم پر پھٹے پرانے اور بوسیدہ پیوند لگے کپڑے تھے،لیکن دنیا انتہائی ذلت کے ساتھ آپ کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھی۔

''شاہوں اور حکمرانوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی کرسیاں چھوڑ کر الگ ہو جائیں کیونکہ دنیا کو ذلیل ورسوا کر کے اس کو حاصل کرنے والا اور لوگوں کے درمیان تقسیم کردینے والا جلوہ افروز ہو چکا ہے۔مسلمان مجاہدین اس عظیم فتح پر مسجد اقصیٰ کے پاس اکٹھے ہو چکے ہیں۔ان میں جلیل القدر صحابہ کرام ہیں، دور مکی کے ستم رسیدہ بھی ہیں، جنگ بدر کی آزمائش سے دوچار ہونے والے بھی اور بیعت رضوان میں جان کی بازی لگانے کا عزم صمیم کرنے والے بھی، رسول اکرمﷺ کی پیش گوئی کے مستحقین بھی ہیں اور دنیا کو ذلیل و رسوا کر کے اسے قدموں میں روندنے والے بڑے بڑے سپہ سالار بھی!

ظہر کی نماز کا وقت آن پہنچا ہے۔امیر المومنین عمر بن خطابؓ کی نظر کے سامنے رسول اکرمﷺ کے ہمراہ گزری ہوئی زندگی کے مختلف النوع نقشے گھوم جاتے ہیں۔فرماتے ہیں۔

''اے بلال! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ آپ ہمارے لیے اذان پکاریں۔''

حضرت بلالؓ نے عرض کی۔

''میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں گزشتہ ایام کی یاددہانی نہ کرائیں۔''

صحابہ کرام گویا ہوئے:

''اے بلال! آپ اللہ سے خوف کھائیں، امیر المومنین نے آپ سے درخواست کی ہے۔''

چنانچہ حضرت بلالؓ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جذبات کالحاظ کیا اور اذان دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس وقت حضرت بلالؓ بوڑھے ہو چکے تھے اور جسم کمزور ہو چکا تھا۔ جب اذان بلالی کی آواز بلند ہوئی تو ساتھ ہی امیر المومنین کے رونے کی آواز بلند ہونے لگی حتیٰ کہ حضرت بلال کی اذان پر امیر المومنین کی آہ و بکا سبقت لے گئی۔ ادھر سارے صحابہ کے رونے کی آوازیں بھی ہر طرف بلند ہونے لگیں۔ اب کیا تھا، سارا لشکر رو پڑا اور مجاہدین اسلام کے رونے سے مسجد اقصیٰ کے درو دیوار لرز اٹھے، کیونکہ حضرت بلالؓ نے اپنی اذان سے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کا زمانہ یاد دلا یا تھا۔ مجاہدین اسلام اذان بلالی سن کر اپنے معلم و محبوب کی یاد میں گم ہو چکے تھے اور رونے سے ان کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں!

پھر حضرت بلالؓ نے ملک شام ہی کو اپنا مسکن بنالیا اور مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہیں انہوں نے بڑھاپے کی سرحد سے گزرتے ہوئے موت کو گلے سے لگایا۔ بلالؓ عالم سکرات میں یہ شعر پڑھتے رہے۔

ترجمہ: ''کل ہم اپنے پیاروں سے ملاقات کریں گے محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے۔''

اور پھر وہیں ۲۰ھ میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔''

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ہمیں خدا کیسے ملا؟

(ڈاکٹرعبدالغنی فاروق)

خولہ لکاتا ایک نومسلم جاپانی خاتون ہیں۔زیرنظر مقالہ ان کے انگریزی کتابچہ(AView Through the Hijab) کا ترجمہ ہے۔انہوں نے جنوری ۱۹۹۱ء میں فرانس میں اسلام قبول کیا۔ یہ تحریر استدلالی نہیں بلکہ پاکیزہ احساسات اور عفیف جذبات سے معمور ہے۔ جو اسلامی حجاب کے متعلق کتنے ہی مقالوں پر بھاری ہے۔ یہ مقالہ رام پور بھارت کے ماہنامہ ''حجاب'' کے شمارہ جنوری ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ترجمہ عبدالجلیل صاحب نے کیا ہے۔

۱۹۹۱ء کے اوائل میں جب فرانس میں میں نے اسلام قبول کیا تو اِسکول میں حجاب کا استعمال گرماگرم بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔فرانسیسی معاشی مسائل سے دوچار تھے جس کے نتیجہ میں کثیر بے روزگاری اور عدم تحفظ کا ظہور ہوا جس کا شدت کے ساتھ احساس بڑے بڑے شہروں میں رونما ہوا اور بے روزگاری کے اسباب میں سے ایک سبب خصوصیت کے ساتھ مسلم ممالک سے آنے والے تارکین وطن کو سمجھا گیا۔اپنے شہروں اور اسکولوں میں حجاب کو دیکھ کر ان کے اندر زبردست منفی رُجحانات پیدا ہوئے۔عوام کی اکثریت کا خیال تھا کہ پبلک ایجوکیشنل سسٹم میں حجاب استعمال کرنے کی اجازت دینا سیکولرزم کے خلاف ہے۔میں اس وقت تک مسلمان نہ ہوئی تھی اس لئے یہ نہ سمجھ سکی کہ اگر کوئی طالبہ اپنے سر پر صرف کپڑا لگا لیتی ہے تو اسکول اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔ میں یہ بھی نہ سمجھ سکی کہ مسلمانوں کے نزدیک حجاب استعمال کرنے کی اہمیت کیا ہے؟ لیکن میرا خیال تھا کہ طالبات کو ان کے عقائد اور مذہبی معاملات کی ادائیگی کے سلسلہ میں اسکولوں کو غیر جانب دار رہنا چاہئے اور انہیں ان معاملات میں اس وقت تک منع نہیں کرنا چاہیے جب تک اس سے اسکول کا ڈسپلن خراب نہ ہو۔(حجاب استعمال کرنے کی وجہ سے کچھ مسلم لڑکیوں کا فرانسیسی اسکولوں سے اخراج بھی کیا گیا تھا)۔

فرانسیسیوں کو زیادہ تر مغرب والوں کی طرح یہ توقع تھی کہ تاریخ میں حجاب کا نام اسی طرح ختم ہو جائے گا جس طرح مغربیت اور سیکولرزم نے اپنی بنیادیں مضبوط کر لی ہیں۔ بہر کیف عالم اسلام میں خاص طور سے نوجوان نسل کے اندر مختلف ممالک میں پردے کی طرف مراجعت کی ایک زبردست لہر پھیل رہی ہے۔ یہ موجودہ بیداری یا اسلامی احیاء کا اظہار ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی عظمت و تشخص کو نو آبادیاتی نظام اور معاشی استحصال کے ذریعہ متعدد بار برباد کیا جا چکا ہے۔ اس لئے یہ عمل ان کی عظمت رفتہ کے دوبارہ حصول کا ایک جزو ہے۔

میرا تعلق جاپان سے ہے۔ تاریخی اعتبار سے مغربی ثقافت کا تجربہ ہم نے پہلی بار میجی دور میں کیا۔ (۱۸۶۰ء کے عشرے میں جب کہ جاپان دوسرے ممالک کے لئے بند کر دیا گیا تھا) اس دور میں جاپانیوں کے اندر مغربی طرز زندگی اور لباس کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ اسی طرح ہم لوگوں کو عربوں نیز دوسرے اسلام کے ماننے والوں کی حمایت کا موازنہ ہماری قدیم روایت پسندی یا مغربیت کی مخالفت سے کیا جا سکتا ہے جس کا خود جاپانیوں کو تجربہ ہے۔ انسان کے اندر قدامت پسندی کا میلان جھلکتا ہے لہٰذا وہ غیر شعوری طور پر نئے اور غیر مانوس طرز حیات کو قبول کرنے کے بجائے شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کبھی یہ جاننے اور سمجھنے کے لئے نہیں رُکتا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟

ایسا ہی ان غیر مسلموں کا معاملہ ہے جو حجاب کو ظلم کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ مسلم عورتوں کو رسم ورواج کا پابند بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی قابل افسوس حالت سے ناواقف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم عورت کی نجات تحریک آزادی نسواں یا کسی ایسی اقتصادی و معاشرتی اصلاح کے ذریعہ ہوگی جو اس کو آزادی دے، اس کے ذہن کو بیدار کرے اور اسے رسم ورواج نیز حجاب کی پابندیوں سے آزاد کرے۔

اس نرالے طرز فکر کو عام طور سے ان سبھی لوگوں نے مشترکہ طور پر اپنایا ہے جنہیں اسلام کے

بارے میں بہت کم معلومات ہیں ۔سیکولرازم اور مذہبی انتخابیت کے عادی غیر مسلم عام طور پر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کوئی شخص ان کی زندگی کے رُخ کو بدل کر اس مذہب کے مطابق کیوں کرنا چاہتا ہے جو صدیوں پہلے رائج ہوا تھا۔ وہ اسلام کی قوت اور اپیل کو نہیں سمجھتے جو عالم گیر اور لازوال ہے۔ وہ اس حقیقت سے پریشان ہیں کہ دنیا کی مختلف قومیتوں کی ان عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو اسلام کی طرف راغب ہو رہی ہیں اور اپنے آپ کو پوشیدہ کر رہی ہیں اس ''انوکھی شئے'' سے انہیں پریشانی لاحق ہے۔ایک ایسی غیر منعکس شئے جو صرف عورت کے گیسوہی کو پوشیدہ نہیں رکھتی بلکہ اس کے سارے بدن کو بھی پوشیدہ رکھتی ہے جہاں تک ان کی نظروں کی رسائی نہیں ہو سکتی ۔کوئی غیر مسلم باہر سے اندازہ نہیں کر سکتا کہ حجاب کا فلسفہ کیا ہے؟ اس موضوع سے متعلق بہت سی کتابوں کا انداز بھی سرسری اور خارجی جائزے کا ہے۔ان کے مصنفین کے حاشیہ خیال میں بھی وہ حقیقت نہیں آ سکتی جو ایک عورت کی نگاہ حجاب کے اندر سے بھانپتی ہے اور ۱۹۹۱ء میں مسلمان ہونے کے بعد ہی میرے تصورات اس سلسلہ میں واضح ہوئے ۔

حجاب کے ذریعہ مجھے کسی ملک ،رسم و رواج یا معاشرتی شناخت کا دفاع نہیں کرنا ہے ۔اس سے نہ تو میری سماجی اور نہ ہی سیاسی اہمیت بڑھتی ہے ۔بلکہ یہ صرف مذہبی عقیدے کا اظہار کرتا ہے ۔

اِن ایام میں جب کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں اسلام قبول کروں یا نہ کروں میں نے اپنے اندر سنجیدگی کے ساتھ روزانہ پانچ مطلوبہ عبادات ادا کرنے کی صلاحیت اور رُجحان کا اندازہ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی حجاب پہننے کے بارے میں سوچا تھا۔ہو سکتا ہے کہ میں اس بات سے خائف تھی کہ میرے مسلمان ہونے کے فیصلہ پر اثر انداز ہونے کیلئے میرے اندر منفی رُجحان نہ پیدا ہو جائے ۔ پیرس کی مسجد میں پہلی بار جانے سے قبل میں ایک ایسی دنیا میں رہتی تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نماز اور حجاب سے یکسر ناواقف تھی ۔پھر بھی میرے اندر کوئی چیز رونما ہو چکی تھی اور اسلامی برادری میں داخل ہونے کی میری خواہش اتنی شدید تھی کہ میں اس بات سے قطعاً پریشان

نہ تھی جس سے مذہب تبدیل کرنے کے بعد میرا سابقہ ہوتا۔ دراصل یہ امر قابل توجہ ہے لیکن مجھ کو اللہ تعالٰی کی رحمت و عنایت سے اسلام کیلئے ہدایت نصیب ہوئی تھی۔

اگرچہ میں حجاب کی عادی نہ تھی لیکن اپنا مذہب تبدیل کرنے کے بعد میں فوراً ہی اس کا فائدہ محسوس کرنے لگی۔ مسجد میں اتوار کے اسلامی لیکچر میں پہلی مرتبہ شامل ہونے کے چند دن بعد اگلے اتوار کو پہننے کیلئے میں نے سکارف خریدا۔ مجھ سے کسی نے سکارف پہننے کو نہیں کہا تھا۔ میں مسجد اور وہاں کی دوسری مسلم بہنوں کے احترام میں ایسا کرنا چاہتی تھی۔ میں اتوار کی آمد کیلئے بے قرار تھی کیونکہ گزشتہ لیکچر نے مجھے ایک ایسے روحانی جذبے سے سرشار کیا تھا جس کا اس سے قبل مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ میرے دل میں روحانیت کی پرورش کیلئے اتنی اشتہا تھی کہ میں نے لیکچر کے ہر لفظ کو اس طرح جذب کرلیا جیسے خشک سپنج پانی کو جذب کرتا ہے۔ دوسرے اتوار کو لیکچر روم میں جانے سے قبل میں نے وضو کیا اور سکارف پہنا۔ لیکچر کے بعد میں پہلی بار نماز والے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے دوسری بہنوں کے ساتھ نہایت خوشی سے نماز ادا کی۔ مسجد میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں نے مجھ کو اتنا مسرور اور مطمئن کردیا تھا کہ وہاں سے نکلنے کے بعد بھی اس مسرت کو اپنے دل میں محفوظ کرنے کیلئے میں سکارف پہنے رہی۔ چونکہ وہ سردیوں کا موسم تھا اس لئے لوگوں کو میرا سکارف اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا۔ عوام میں یہ میرا حجاب کا پہلا مظاہرہ تھا اور مجھے اپنے اندر ایک فرق کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو پاکیزہ اور محفوظ سمجھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اللہ سبحانہ وتعالٰی سے زیادہ قریب ہوگئی ہوں۔

دوسرے ملک میں ایک جاپانی عورت کی وجہ سے لوگ مجھ کو پبلک مقامات پر گھور کر دیکھتے تھے تو میں مضطرب ہوجاتی تھی۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو حجاب کی وجہ سے محفوظ سمجھتی تھی۔ اب میں اپنے آپ کو غیر شائستہ نگاہوں کا مرکز نہیں سمجھتی تھی۔

اس کے بعد میں جب بھی باہر گئی تو حجاب میں گئی۔ یہ ایک ایسا بے ساختہ اور رضا کارانہ عمل

تھا جس کو کسی نے مجھ پر جبراً نہیں لادا تھا۔ اسلام سے متعلق پہلی کتاب جس کا میں نے مطالعہ کیا اس میں ''حجاب'' کو معتدل انداز میں واضح کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس کی پر زور نصیحت کرتا ہے''۔ اگر کسی نے تحکمانہ لہجہ میں کہا ہوتا کہ ''جیسے ہی تم اسلام قبول کرو تو تم حجاب ضرور استعمال کرو'' تو میں اس حکم کے خلاف ضرور بغاوت کر دینا چاہتی تھی۔ اسلام کا مطلب ہے اللہ کی مرضی کیلئے سپردگی اور اس کے احکام کی اطاعت کیلئے سر تسلیم خم کرنا۔ مجھ جیسی ہستی کیلئے جس نے برسوں بغیر کسی مذہب کے زندگی گزاری تھی کسی حکم کی بلا شرط تعمیل کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے احکامات بغیر کسی غلطی کے ہیں اور صحیح اسلامی طریقہ انہیں بلا چون و چرا تسلیم کرنا اور نافذ کرنا ہے۔ یہ صرف انسانی فہم و ادراک ہے جس سے غلطی کا ارتکاب ہوتا ہے اور میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اپنی قوتِ استدلال پر اعتماد رکھتی تھی۔ اور کسی حاکم اعلیٰ کے وجود یا ضابطہ اخلاق کو تسلیم کرنے کی ضرورت سے متعلق مسلسل سوالات کیا کرتی تھی۔ بہر کیف میری زندگی کے اس موڑ پر میری خواہشات بے ساختہ طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو گئیں۔ الحمدللہ میں اسلامی فرائض کو بلا کسی جبر کے احساس کے ادا کرنے کے لائق ہو گئی تھی۔

میں اپنے نئے خول میں مطمئن تھی۔ حجاب صرف اللہ کی اطاعت کی ہی علامت نہ تھا بلکہ میرے عقیدے کا برملا اظہار بھی تھا۔ ایک مسلمان عورت جو حجاب پہنتی ہے جم غفیر میں بھی قابل شناخت ہوتی ہے۔ اس کی برعکس کسی غیر مسلم کا عقیدہ اکثر الفاظ کے ذریعہ بیان کرنے پر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ حجاب کے بعد مجھ کو ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ میرے عقیدے کا یہ کھلا اظہار ہے اور دوسروں کیلئے اللہ تعالیٰ کے وجود کی یاددہانی ہے اور میرے لئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے اور سپردگی کی یاددہانی۔ میرا حجاب مجھے مستعد اور آمادہ کرتا ہے کہ ''ہوشیار ہو جاؤ تمہارا طرزِ عمل ایک مسلم کی طرح ہونا چاہئے''۔ ویسے ہی جیسے ایک پولیس مین اپنی وردی میں اپنے پیشے کا لحاظ رکھتا ہے، اسی طرح میرا حجاب بھی میری مسلم شناخت کو تقویت دیتا ہے۔

اپنا مذہب تبدیل کرنے کے دو ہفتے بعد میں اپنی بہن کی شادی میں شریک ہونے کیلئے جاپان
واپس ہوئی۔ اسلام قبول کرتے ہی میں نے وہ شئے دریافت کرلی تھی جس کی مجھے تلاش تھی اور اب
مجھے فرانسیسی ادب میں ڈاکٹریٹ کے حصول میں مزید دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بجائے میرے
جذبات عربی اور قرآن سیکھنے کی طرف مائل ہوگئے۔ اس لئے میں نے تہیہ کرلیا کہ فرانس واپس نہ
جاؤں گی۔

ایک چھوٹے سے جاپانی قصبہ میں رہنا یقیناً ایک آزمائش تھی۔ میں نے ماضی قریب ہی میں
مذہب تبدیل کیا تھا۔ اسلام سے متعلق میری معلومات بھی کم تھیں نیز دوسرے مسلمانوں سے مکمل
طور پر علیحدہ بھی تھی۔ تاہم اس علیحدگی نے میری اسلامی معلومات کو وسیع کردیا۔ روزانہ پنجگانہ نماز
کی ادائیگی نے میری اسلامی معلومات کو وسیع کردیا۔ روزانہ پنجگانہ نماز کی ادائیگی اور سکارف کے
استعمال نے میری اسلامی شناخت کو مستحکم کرنے میں معاونت کی اور میرے تعلق باللہ کو تقویت
دی۔ میں تنہائی میں اکثر اللہ سے اپنا تعلق استوار کرتی تھی۔

میں جس طرز کا لباس زیب تن کرتی تھی اب اس میں پہلی بار بڑی تبدیلی ہوئی۔ اسلام
عورتوں کو پبلک میں اپنے جسم کی ساخت کی نمائش سے منع کرتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنے بہت سے
کپڑوں کو ترک کرنا پڑا جو میری جسمانی ساخت کو پرکشش بناتے تھے۔ منی سکرٹ، پینٹ، ہاف
پینٹ اور چھوٹی آستین کے بلاؤز حجاب سے مطابقت نہ رکھتے تھے اس لیئے میں نے اپنے لئے
پاکستانی طرز کی شلوار اور جمپر بنایا۔ جب لوگ میرے نئے انوکھے فیشن کو گھور کر دیکھتے تھے تو اس
سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔

مذہب تبدیل کرنے کے چھ ماہ بعد میں نے مصر کا سفر کیا۔ میں نے اپنی عربی اور اسلامی
مطالعہ کی شدید خواہش کی تکمیل کسی مسلم ملک میں کرنے کا عزم مصمم کیا تھا۔ مصر میں صرف ایک
جاپانی شخص کو جانتی تھی۔ میرے میزبان کے گھر میں کوئی انگریزی نہیں بولتا تھا۔ میں اپنے میزبان

کو پہلی نظر میں دیکھ کر سخت متحیر ہوئی۔ وہ سر سے پاؤں تک بشمول سیاہ لباس میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اس سے قبل میں نے فرانس میں ایک عورت کو چہرے کے نقاب کے ساتھ سیاہ لباس میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بڑی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ وہاں ان مسلم عورتوں کے درمیان جو رنگین لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں اور سکارف لگائے ہوئے تھیں، اس کی موجودگی بڑی انوکھی معلوم ہوئی۔ میں نے پھر غور کرنا شروع کیا "یہ ایک ایسی عورت ہے جو عرب رسم و رواج کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہے اور اسلام کی اصل تعلیم سے نابلد ہے"۔ اس وقت میری اسلامی معلومات بہت محدود تھیں۔ میرا اعتقاد تھا کہ چہرہ ڈھانپنے کی جڑیں نسلی رسم و رواج سے منسلک ہیں جس کی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ایسا ہی خیال میرے اندر اس وقت ہوا جب یہ جاپانی عورت مجھے اپنے گھر میں لے گئی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ "آپ غلو سے کام لے رہی ہیں۔ یہ غیر فطری ہے"۔ مردوں سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھنے کی اس کی کوششیں بھی خلافِ معمول معلوم ہوئیں۔

جلد ہی اس بہن نے مجھے بتایا کہ میرے کپڑے پبلک میں استعمال کرنے کیلئے موزوں نہیں ہیں۔ اگرچہ میرا یقین تھا کہ میری پوشاک اسلامی پوشش کے مطالبات کے موافق تھی۔ میرے اندر حالات سے مطابقت کرنے کی کافی صلاحیت تھی۔ مشہور مقولہ ہے کہ "جب روم میں رہو تو وہی کرو جو رومی کرتے ہیں"۔ میں نے ایک سیاہ لباس اور ایک لمبا سیاہ سرپوش جس کو دوپٹہ کہا جاتا ہے بنایا۔ اس طرح میں چہرہ کے علاوہ مکمل طور پر ڈھک گئی۔ میں نے نقاب کے متعلق بھی سوچا۔ فضا کے مستقل گرد و غبار سے محفوظ رہنے کیلئے یہ ایک عمدہ شے لگی، لیکن میری میزبان بہن نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے یہ سوچ کر کہا کہ میں جاپان میں اس پر عمل نہ کرسکوں گی یا میرا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ان بہنوں کا یقین محکم تھا کہ چہرہ چھپانا ان کے مذہبی فرائض کا ایک جزو ہے۔

زیادہ تر وہ بہنیں جن سے میں متعارف ہوئی تھی، نقاب لگاتی تھیں۔ بہر کیف قاہرہ جیسے بڑے شہر میں ان کی تعداد کم تھی۔ کچھ لوگوں کو مبینہ طور پر تکلیف ہوئی اور میرا کالا دوپٹہ دیکھنے کے باوجود بھی گلے ملے۔ عموماً مغرب زدہ مصری مرد برقعہ پوش عورتوں سے دور رہتے تھے اور انہیں ''الاخوات'' کہہ کر پکارتے تھے۔ لوگ اِن کے ساتھ خصوصی احترام اور نرمی کا رویہ رکھتے تھے۔ یہ بہنیں خاص حد تک اندرہی دکھائی دیتی تھیں۔ عموماً برقعہ پوش خواتین اپنے عقیدے کی زیادہ پابند تھیں۔ وہ جو معمولی سکارف لگاتی تھیں یا بالکل ہی نہیں استعمال کرتی تھیں وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سے مکمل طور پر غیر متعلق معلوم ہوتی تھیں۔

قبولِ اسلام سے قبل میں چست پینٹ اور منی سکرٹ زیب تن کرتی تھی۔ لیکن اب میری لمبی پوشاک نے مجھے بہت مسرور کیا اور میں نے سمجھا کہ میں ایک شہزادی کی طرح ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے اس کو زیادہ آرام دہ پایا۔ میں نے سیاہ پوشش کو ناپسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں نے قاہرہ جیسے غبار آلودہ شہر میں اپنی کالی پوشاک کو زیادہ موزوں پایا۔ میری مسلم بہنیں اپنی سیاہ پوشاک اور دوپٹہ میں بڑی دلکش لگتی تھیں اور جب اپنے چہروں سے نقاب اُٹھاتی تھیں تو اندرونی نور نمایاں ہوتا تھا۔

میں اپنے قیامِ قاہرہ کے دوران سیاہ برقعہ میں بہت خوش تھی۔ بہر کیف اس وقت میرے اندر منفی ردِعمل پیدا ہوتا تھا جب میری مصری بہنیں مجھے مشورہ دیتی تھیں کہ جب میں جاپان واپس جاؤں تو وہاں بھی اسی طرح رہوں۔ مجھے اس بات پر خفگی اور ندامت ہوئی کہ اس وقت جو میں سوچتی تھی وہ نادانی تھی۔ میری دانست میں اسلام عورتوں کو اپنی ستر پوشی اور شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل میں کوئی عورت برقعہ کا جو طرز پسند کرے استعمال کرسکتی ہے۔ (اسلامی برقعہ کیلئے کچھ شرائط ہیں مثلاً یہ نہ تو بہت باریک اور چست ہو اور نہ ہی مزین)۔

ہر سماج کا اپنا ایک فیشن ہوتا ہے۔ میرا تصور تھا کہ اگر جاپان کی گلیوں میں لمبی سیاہ پوشاک

زیب تن کر کے منظر عام پر آؤں تو مجھے پاگل سمجھا جائے گا۔ میں نے اپنی مصری بہن سے مباحثہ کرتے ہوئے کہا کہ میری نئی پوشاک سے جاپانیوں کو گہرا صدمہ ہوگا اور کوئی میری بات نہیں سنے گا۔ وہ اسلام کو صرف اس کے ظاہر ہی سے رد کر دیں گے اور اس کی تعلیمات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

بہر حال مصر میں اپنے قیام کے اختتام تک میں اپنے لمبے لباس کی عادی ہوگئی تھی اور اسے جاپان میں بھی پہننے کا خیال تھا۔ حالانکہ مجھے اپنے ملک میں سیاہ لباس زیب تن کرنے میں اب بھی تکلف تھا، اِس لئے میں نے کچھ ہلکے رنگ کے لباس اور دوپٹے بنائے۔ اس طرز کی پوشاک زیب تن کیے ہوئے میں ایک بار پھر اپنے وطن واپس ہوئی۔

جاپان میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ کوچہ و بازار میں وہ نظر نہیں آتے۔ تاہم میرے سفید دوپٹے کے تئیں جاپانیوں کا رویہ ہمت افزا تھا۔ مجھے اِس ضمن میں نہ تو ناپسندیدگی اور نہ ہی تضحیک کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں نے مان لیا تھا کہ میرا تعلق کسی مذہب سے ہے، لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ کس سے؟ میں نے ایک لڑکی کو اپنی ساتھی سے دھیرے سے یہ کہتے سنا کہ میں بدھ مذہب کی راہبہ ہوں۔ دراصل اسلام قبول کرنے سے بہت پہلے میرے اندر ایک مذہبی راہبہ کی زندگی گزارنے کی زبردست خواہش تھی۔ یہ بڑا دلچسپ پہلو ہے کہ ایک مسلم اور عیسائی یا بدھسٹ راہبہ کی خارجی ہیئت میں بڑی حد تک مشابہت ہے۔ ایک بار میں پیرس کے سفر میں ایک کیتھولک راہبہ کے ساتھ کار پر سفر کر رہی تھی۔ ہم میں اتنی مشابہت تھی کہ میں بمشکل اپنے تبسم کو روک سکی۔ کیتھولک راہبہ کا لباس اپنے آپ کو اللہ کیلئے وقف کر دینے کی علامت ہوتا ہے اور اس کیلئے احترام کیا جاتا ہے اور یہی اس کی پہچان بھی ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے مسلم عورت کا حجاب بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا مظہر ہوتا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ ایک راہبہ کے لباس کا احترام کرتے ہیں اور مسلمان عورت کے حجاب کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں اور اسے ایک

علامت کی بجائے انتہاپسندی اور مظلومیت کا مظہر گردانتے ہیں۔

ایک بار ٹرین میں ایک بزرگ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کیوں یہ نرالی طرز کا لباس پہنتی ہوں۔ میں نے وضاحت کی کہ میں مسلمان ہوں اور عورتوں سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ غیر مردوں سے اپنا جسم پوشیدہ رکھیں کیونکہ کمزور طبیعت کے مردوں کو عورتوں کی دلکشی اور حسن کی تحریص کو روکنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک شخص ہمیشہ عورتوں کی طرف جنسی جذبہ کے تحت نہیں دیکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن مسئلہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جو ایسا کرتے ہیں۔ ان غیر معمولی جنسی زیادتیوں اور جرائم پر غور کیجئے جو بہت سے معاشروں میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ہم ان حادثوں کو مردوں کے اعلیٰ اخلاق او رضبطِ نفس کی تلقین کر کے نہیں روک سکتے۔ اس کا حل صرف اسلامی طرزِ حیات ہی میں مضمر ہے جو عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پردے میں رکھیں اور مردوں سے تعلق رکھنے سے ممکنہ حد تک اجتناب کریں۔ ایک چھوٹے سکرٹ کی وضاحت ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ ''اگر آپ کو میری ضرورت ہے تو مجھے لے جاسکتے ہیں''۔ حجاب صاف طور پر یہ بتاتا ہے کہ ''میں آپ کیلئے ممنوع ہوں''۔ بزرگ اس وضاحت سے کافی متاثر دکھائی دیے۔ شاید اس لئے کہ وہ آج کل کی عورتوں کے ہیجان انگیز فیشن کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹرین سے یہ کہتے ہوئے اُتر گئے کہ کاش ہمارے پاس اسلام سے متعلق گفتگو کرنے کیلئے مزید وقت ہوتا۔ جاپانی لوگ عموماً مذہبی گفتگو کے عادی نہیں تاہم میرے حجاب نے اسلام پر گفتگو کرنے کا دروازہ کھول دیا۔

میرے گھر میں صرف میرے والد صاحب کو میرے متعلق زیادہ تشویش تھی کیونکہ میں مکمل پردے میں رہتی تھی، گرم ترین دن میں بھی۔ موسم گرما میں ہر شخص گرمی محسوس کرتا ہے، لیکن میں نے حجاب کو اپنے سر اور گردن پر براہِ راست سورج کی کرنوں سے بچنے کا موزوں ذریعہ پایا۔ شاید میرے عزیز و اقارب میرے قریب رہنے کو اپنے لئے غیر موزوں سمجھتے تھے۔ تاہم میں اپنی چھوٹی

بہن ۔۔۔جونیکر پہنے ہوئے تھی ۔۔۔کی ران دیکھ کر مضطرب ہوگئی ۔اپنا مذہب تبدیل کرنے سے پہلے بھی کسی عورت کے جسم کی ساخت کا منظر جو اس کی جلد سے چپکے ہوئے باریک لباس سے جھلکتا تھا مجھے پریشان کردیتا تھا۔مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے کوئی ایسی شے دیکھ لی ہے جس کو مجھے نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔(یہ جملہ عورت کی فطرت کا عکاس ہے)۔اگر یہ بات مجھے پریشان کر سکتی ہے جب کہ میں ہم جنس ہوں تو یہ مردوں کو کتنا متاثر کرتی ہوگی،اس کا تصور مشکل نہیں ہے۔

کچھ عورتیں صرف اس وقت عمدہ پوشاک زیب تن کرتی ہیں جب وہ گھروں سے باہر جاتی ہیں اور انہیں یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ گھروں کے اندر کس طرح رہتی ہیں۔لیکن اسلام میں عورت اپنے شوہر کیلئے دلکش ہونے کی کوشش کرتی ہے اور شوہر بھی اپنی بیوی کیلئے پرشکوہ دکھائی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ایک دوسرے کے متعلق اس طرح کے جذبات ازدواجی زندگی کو پرلطف اور پر مسرت بناتے ہیں۔کوئی عورت کسی مرد کی توجہ کیوں اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے جب کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔کیا وہ اس بات کو پسند کرتی ہے کہ دوسری عورتیں اس کے شوہر کو اپنی طرف مائل کریں؟اس طرح کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ اسلام خاندان کے استحکام میں کس طرح معاونت کرتا ہے۔

صرف عورتوں کو ہی اپنے جسم پوشیدہ رکھنے کے احکام صادر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ مردوں کو بھی اپنی نظریں نیچی رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔کھیل کود کے دوران بھی مردوں سے گھٹنوں تک اپنے جسم کے حصوں کو پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔

غیر مسلم یہ سوچ سکتے ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو کپڑوں میں پوشیدہ رکھنے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہیں۔وہ پوچھ سکتے ہیں کہ ''جسم کی فطری حالت کو کیوں پوشیدہ رکھا جائے؟ کچھ لوگ تیراکی کا عریاں لباس پہن کر تیرنے یا ننگوں کے کلب میں شامل ہونے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے۔پھر بھی پچاس سال قبل جاپان میں تیراکی کے لباس میں تیرنا لفنگا پن سمجھا

جاتا تھا۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جسم پوشیدہ رکھنے کا معاشرے کا معیار تبدیل ہو چکا ہے۔ اگر آپ کسی شے کو پوشیدہ رکھیں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ عورتوں کے جسم کو پوشیدہ رکھنے سے اس کی جاذبیت اور دلکشی بڑھ جاتی ہے جیسا کہ دنیا کی بیشتر ثقافتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اخلاقی قدریں زمانے سے متاثر ہو سکتی ہیں تو یہ تصور ناممکن نہیں ہے کہ مستقبل میں لوگ گلیوں میں بغیر کپڑوں کے عریاں گھومیں گے۔ اسے کوئی شے نہیں روک سکتی۔ ہم مسلمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کیلئے معیار متعین کر دیا ہے۔ ہم اس کی اتباع کرتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہی ہمارا خالق ہے اور جانتا ہے کہ ہمارے لیے کیا سب سے مفید اور بہتر ہے؟

میں سمجھتی ہوں کہ انسانی تہذیب کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کے اندر شرم کا احساس اُبھرا۔ اگر ایک انسان اپنی جسمانی خواہشات اور وظائف کی تکمیل چاہتا ہے اور ایسا ہی کھلے عام کرتا ہے تو وہ جانور سے مختلف نہیں ہے۔ لیکن افسوس یہی واحد راستہ ہے جس پر انسان سر پٹ چلا جا رہا ہے؟ سوال یہ ہے کہ مناسب لباس اور اخلاق کا تعین کون کرے گا۔۔۔؟ خود انسان (جس کا معیارِ قدر ہوا کے رُخ کے ساتھ بدلتا ہے) یا اللہ تعالیٰ؟ وہ اللہ ہی ہے جو انسان کے ہر زمانے کے حالات سے باخبر ہے، اسی لئے اس کو عوام میں ظاہر ہونے اور عمل کرنے کے صحیح طریقے کو اس نے واضح کر دیا ہے۔

جاپان واپس آنے کے تین ماہ بعد میں اپنے شوہر (ایک جاپانی مسلمان سے جو قاہرہ میں زیر تعلیم تھے، میں نے اپنے مصر کے قیام کے آخری ایام میں ان سے شادی کر لی) کے ساتھ سعودی عرب گئی جہاں انہیں ملازمت مل گئی۔ میں نے اپنے چہرے کو چھپانے کیلئے ایک چھوٹا سا سیاہ کپڑا بنالیا تھا جس کو نقاب کہا جاتا ہے۔ یہ میں نے اس لئے نہیں بنایا تھا کہ میں نے اپنی قاہرہ والی بہن کے طرز پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مثلاً یہ کہ پردہ ایک مسلمان عورت کے مطلوبہ لباس کا ایک جزو

ہے، بلکہ میرا خیال تھا کہ چہرہ اور ہتھیلی کھلی رکھنے کی اجازت تھی، تاہم مجھے سعودی عرب جانے اور چہرے کا نقاب لگانے کی شدید خواہش تھی۔ مجھے یہ جاننے کا اشتیاق و تجسس تھا کہ پردے کے اندرون مجھے کیسا لگے گا؟

ریاض پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کبھی عورتیں چہرے کا نقاب نہیں لگائے ہوئے تھیں۔ غیر مسلم عورتیں اپنے سروں کو ڈھکے بغیر لاپروائی کے ساتھ اپنے شانوں پر سیاہ عبا ڈالے رہتی تھیں۔ بہت سی غیر ملکی مسلم عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ پھر بھی تمام سعودی عورتیں سر سے پاؤں تک مکمل طور پر پردے کا استعمال کرتی تھیں۔

پہلے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مسلم بہنیں برقع کے اندر آسانی سے کیسے سانس لے سکتی ہیں۔ اس کا انحصار عادت پر ہے جب کوئی عورت اس کی عادی ہو جاتی ہے تو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ پہلی بار میں نے نقاب لگایا تو مجھے بڑا عمدہ لگا۔ دراصل انتہائی حیرت انگیز، ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک اہم شخصیت ہوں۔ مجھے ایک ایسے شاہکار کی مالکہ کا احساس ہوا جو اپنی پوشیدہ مسرتوں سے لطف اندوز ہو میرے پاس ایک خزانہ تھا جسکے بارے میں کسی کو معلوم نہ تھا، جسے اجنبیوں کو دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

ریاض میں ابتدائی چند مہینوں تک صرف میری آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ لیکن جب میں نے جاڑے کا برقع بنایا تو اس میں آنکھوں کا باریک نقاب بھی شامل کر لیا۔ اب میرا پردہ مکمل تھا۔ اس سے مجھے یک گونہ آرام ملا۔ اب مجھے بھیڑ میں کوئی پریشانی نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں مردوں کیلئے غیر مرئی ہوگئی ہوں۔ آنکھوں کے پردے سے قبل مجھے اس وقت بڑی پریشانی ہوتی تھی جب اتفاقیہ طور پر میری نظریں کسی مرد کی نظروں سے ٹکراتی تھیں۔ اس نئے نقاب نے سیاہ عینک کی طرح مجھے اجنبیوں کی گھورتی نگاہوں سے محفوظ کر دیا۔ ایک غیر مسلم کسی داڑھی والے مرد کو ایک سیاہ برقع پوش خاتون کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ اس جوڑے کے متعلق ایک ایسے ہیولے کا تصور ہو

سکتا ہے جو ظالم و مظلوم یا غالب و مغلوب ہو۔ اسلام میں شوہر و بیوی کا تعلق ایک صفت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح عورت یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کا احترام اور حفاظت ایک ایسے شخص کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو واقعتاً اس کا لحاظ کرتا ہے، یا میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ ایک ایسی شہزادی جس کا ہم سفر اس کا محافظ ہوتا ہے۔ یہ کہنا زبردست مغالطہ ہے کہ مسلم عورتیں مردوں کی صرف نجی ملکیت ہیں اور انہوں نے حسد کی بنا پر اس بات سے روک دیا ہے کہ اجنبی مرد انہیں دیکھیں۔ ایک عورت اپنے آپ کو اللہ کے فرمان کی اتباع میں چھپائے رکھتی ہے تا کہ اس کو عظمت و سربلندی حاصل ہو۔ وہ گھورتی ہوئی اجنبی نگاہوں کا محور بننے یا ان کی شے ہونے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر مغربی عورتوں کیلئے ہمدردی اور ترحم کا جذبہ رکھتی ہے جنہیں سینکڑوں ہوس ناک نگاہیں بے رحمی سے گھورتی ہیں اور جنہیں نفسانی خواہشات کے لئے بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مجھے مسلمان ہوئے دو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ میرے ماحول اور مذہبی شعور کے ساتھ ساتھ میرا حجاب پانچ بار تبدیل ہوا۔ فرانس میں اپنا مذہب تبدیل کرنے کے فوراً بعد میں نے ہم رنگ فیشن ایبل لباس اور سکارف استعمال کیے۔ سعودی عرب میں اب میں سر سے پاؤں تک مکمل سیاہ نقاب میں پوشیدہ ہوں اس لئے مجھے حجاب کے آسان ترین طرز سے مکمل طرز کا تجربہ ہے۔

کئی سال قبل جب ایک جاپانی مسلمہ سر پر دوپٹہ لگائے ہوئے ٹوکیو کی ایک مسلم تنظیم میں نظر آئی تو جاپانی مسلم عورتوں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے لباس کے معاملے میں دوبارہ غور کرے کیونکہ اس طرز کے لباس سے جاپانیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس وقت جاپان میں بہت کم عورتیں اپنے سروں کو چھپاتی تھیں۔ اب زیادہ سے زیادہ جاپانی عورتیں اسلام قبول کر رہی ہیں اور مشکل حالات کے باوجود سروں کو چھپا رہی ہیں۔ وہ سب یہ تسلیم کرتی ہیں کہ وہ اپنے حجاب پر نازاں ہیں

اور اس سے ان کے ایمان ویقین کو تقویت ملتی ہے۔

باہر سے حجاب کو دیکھ کر کوئی شخص اس شے کا تصور ہی نہیں کر سکتا جو اس کے اندرون سے مشاہدہ ہوتا ہے ہم اس معاملے کو دو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھتے ہیں۔ایک: غیر مسلم کو اسلام ایک جیل خانہ کی طرح نظر آتا ہے جس میں کسی طرح کی آزادی نہیں ہے۔لیکن اسلام میں رہ کر ہمیں سکون، آزادی اور ایسی مسرت کا احساس ہوتا ہے جس کو کسی اور شکل سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک پیدائشی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ وہ اسلام کو سب سے بہتر طرز حیات سمجھتا ہے، کیونکہ وہ اس سے ابتدا ہی سے واقف ہوتا ہے اور باہر کی دنیا کے کسی اور تجربے کے بغیر وہ بڑا ہوتا ہے، لیکن میں تو پیدائشی مسلمہ نہیں ہوں، بلکہ میں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے، میں نے نام نہاد آزادی اور جدید طرز حیات کی دلفریبیوں اور لذتوں کو خیر باد کہہ کر اسلام کا انتخاب کیا ہے۔اگر یہ درست ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو عورتوں پر ظلم کر رہا ہے تو آج یورپ، امریکہ، جاپان اور دوسرے ممالک میں بہت سی خواتین اسلام کیوں قبول کر رہی ہیں؟ کاش کہ لوگ اس پر روشنی ڈالتے۔

کوئی شخص تعصب کی عینک لگا کر کسی ایسی عورت کے مقام کا مشاہدہ کرنے کے لائق نہیں ہو سکتا جو حجاب میں پر اعتماد، مطمئن، پر سکون اور باوقار ہو۔جس کے چہرے پر مظلومیت کا سایہ تک نہ ہو۔قرآن مجید ان لوگوں کو اندھا کہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے منکر ہیں۔اس طرح ہم واضح کر سکتے ہیں کہ اسلام کو سمجھنے میں غیر مومن کی سمجھ بوجھ ناقص ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ ''حجاب'' رام پور جنوری ۱۹۹۷)

اسلامی انقلاب۔۔۔عورت کا کردار

(صاحبزادہ خورشید گیلانی)

ہمارا معاشرہ بوجوہ ذکی الحس بن چکا ہے،جس کے نتیجے میں "سب کچھ"یا "کچھ بھی نہیں" کی کیفیت قدم قدم پر عنان گیر ہوتی ہے،کوئی سیاسی مسئلہ ہو یا عمرانی،کوئی دینی معاملہ ہو یا معاشی، ہر ایک میں یہی دو انتہائیں نظر آتی ہیں،حالانکہ امت مسلمہ جو قرآن مجید کی نظر میں "امتہ وسطی" ہے اس کا رویہ جارحانہ اور انتہاپسندانہ نہیں بلکہ عادلانہ اور دانشمندانہ ہونا چاہئے۔

ہمارے ہاں سیاست میں مطلق آمریت چلتی ہے یا پھر بے ہنگم اور اصول نا آشنا جمہوریت کا نعرہ بلند ہوتا ہے،معیشت کا پنڈولم کبھی اشتراکیت کی طرف جھکتا ہے اور کبھی سرمایہ داری کی جانب،اور اسی طرح بودوباش اور طرز زندگی میں یا تو اقوام مغرب کی بندر جیسی نقالی کا رواج ہے یا پھر تاریک دور کے مڑے تڑے اور گلے سڑے ضابطے اور قاعدے مقدس قرار پاتے ہیں،جبکہ انتہاپسندی کے ان دو نا معقول رویوں کے درمیان بیسیوں راہیں معقولیت،توازن،اعتدال،نظم وضبط اور روشن قدروں کی نکلتی ہیں۔

ایک عرصے سے عالم اسلام بالعموم اور پاکستان بالخصوص ایک مسئلے پر اعصابی تناؤ اور ہیجانی کیفیت کا شکار بنا ہوا ہے اور وہ مسئلہ ہے عورت کی حیثیت،عورت کے کردار اور عورت کے تشخص کا۔ظاہر ہے عورت کا وجود جتنا قدیم ہے اس کی حیثیت،کردار اور تشخص کا مسئلہ بھی اتنا ہی قدیم ہے۔

ہندو سماج،یہودی مذہب،بدھ مت،عیسائیت ان سب نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے عورت کے کردار پر بحث کی ہے،لیکن ہمیں اس کی تحقیق مطلوب نہیں ہم چونکہ مسلم سوسائٹی کے فرد ہیں اس لئے ہم اسلام کے مزاج کو سمجھیں کہ وہ عورت کا کردار کس طرح متعین کرتا ہے؟

اس وقت ہمارے پیش نظر کوئی فنی یا فقہی بحث نہیں جس کے لئے کتابی حوالے اور عبارات درکار ہوں مقصود صرف اسلام کے مزاج کو سمجھنا ہے،اس لئے فقط اشارات ہی ہمارے لئے مفید

مطلب ہوں گے۔

اسلام کا مزاج عدل ہے اور اسلام کے نام لیواؤں کا مزاج تسلیم کا ہونا چاہئے، کہ اگر یہ منشائے خدا اور رسولؐ ہے تو اس کے آگے حجت نہیں اطاعت کا رویہ اپنانا چاہئے، اور یہی سلامتی کی راہ ہے، مسئلہ ایمان اور ایقان کا ہے رہی بحث تو آج تک کسی گاؤدی سے ارسطو اور افلاطون تک نہیں جیت سکے، کجا کہ کوئی ہم پلہ اپنی ہار مان لے۔

ہم ہزار پہلوؤں سے دلائل لا کر اپنی مرضی کے اسلامی احکام وضع اور ثابت کر لیتے ہیں، یہ رویہ کسی کا بھی ہوسکتا ہے کم از کم مسلمان کا نہیں ہوسکتا کیوں کہ مسلمان کو یہ احساس رہتا ہے۔ کہ اسے اپنے ہر ہر حیلے کا کل خدا کے آگے جواب دینا ہے، جس مسلمان کا دل اس احساس سے معمور ہے وہ مستحب کو بھی واجب کا درجہ دیتا ہے اور جو شخص اس سے عاری ہو وہ نص قطعی کو بھی کسی شاذ روایت سے مسترد کر دے گا۔

ہمارے ہاں جب بھی عورت کے مقام اور کردار کی بات شروع ہوتی ہے تو درمیان میں ضرور امریکی تمدن، یورپی تہذیب اور اشترا کی سوسائٹی کا حوالہ آ جاتا ہے کہ وہاں عورت کا یہ کردار ہے عورت اس طرح زندگی بسر کرتی ہے، عورت کے یہ حقوق ہیں اور عورت کی آزادی کا یہ عالم ہے وغیرہ۔

اگر ہم اسلام کے مزاج شناس ہیں اور اسلامی سوسائٹی کی اخلاقیات سے آگاہ ہیں تو کسی معقول انسان اور مہذب مسلمان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہیں کہ اولاد آدم میں مرد اور عورت بحیثیت جنس پیدائشی طور پر برابر ہیں نہ ان میں کوئی برتر ہے اور نہ کوئی کمتر ہے، صنفی اختلاف سے قطع نظر اہلیت اور صلاحیت میں قدرت نے کسی ایک کے حق میں فیاضی اور دوسرے کے حق میں بخیلی کا رویہ نہیں اپنایا، تکریم مختص ہے بنی آدم کے لئے، اور بنی آدم ترکیب ہے مرد اور عورت دونوں اصناف سے۔

رہی بات دائرہ کار کی تو یہ بالکل دوسرا موضوع ہے، جس طرح اولادآدم کے درمیان اسلام

کی نظر میں قبیلے، شعبے، رنگ، نسل، وطن، زبان کے حوالے سے کوئی امتیاز، فضیلت اور برزگی نہیں اسی طرح مذکر اور مونث ہونا بھی کسی کے لئے فوقیت اور محکومیت کا معیار نہیں۔

دائرہ کار اور حدود و اختیار میں اختلاف مرد اور عورت کی جداگانہ صلاحیتوں کا اظہار تو ہے برتری یا کمتری کا مدار نہیں۔

لیکن ہمارے ہاں بات وہی ذکاوت حس کی آ جاتی ہے اور بحث اپنے نقطہ انتہا پر پہنچ جاتی ہے کہ یا تو مرد کے حقوق پامال ہوتے ہیں یا عورت کا تشخص مجروح ہوتا ہے حالانکہ مسئلہ یہ ہے ہی نہیں جب یہ طے ہے کہ کسی کا مرد ہونا اس کو سر کا تاج نہیں بنا دیتا اور کسی کا عورت ہونا اس کو پاؤں کی جوتی نہیں بنا دیتا مرد مرد ہے اور عورت عورت! دونوں بحیثیت انسان تعظیم اور شرف کے حامل، اور اس شرف کو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

اگر دونوں کا دائرہ کار مختلف ہے تو ہوا کرے شرف و مجد انسانی کے پیمانے کام کاج، پیشے، امارت و غربت، جہل و خرد اور رنگ و نسل سے وضع نہیں ہوتے، مرد کی پگڑی اور ٹوپی جس درجے قابل احترام ہے عورت کا دوپٹہ اور چوٹی بھی اسی درجے واجب الاکرام ہے، باپ اگر بارگاہ ادب ہے تو ماں کے قدم بھی جنت کی دہلیز ہیں۔

اسلام نے اپنے مزاج کے مطابق ٹھیک عدل اور توازن کا سبق دیا ہے اگر اس معاملے میں نہ ملوکیت کا تاریک عہد اور اس کے مہیب قاعدے اور ضابطے چلیں گے اور نہ تہذیب جدید کے دم کٹے رویے قابل قبول ہوں گے ان کے درمیان ایک شاہراہ ہے جس پر چل کر مرد اور عورت اپنا اپنا تشخص کھوئے بغیر زندگی کا کردار ادا کرتے ہوئے دنیا کو جنت نظیر بنا سکتے ہیں۔

اپنے اپنے کردار کی ادائیگی میں آزادی بھی ہے اور مسابقت بھی، لیکن آزادی سے مراد سماجی بے راہروی نہیں اور مسابقت سے مراد احکام الٰہی سے بغاوت نہیں۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح مرد اور عورت کو مختلف میدانوں اور دائروں میں برابر کا کردار ادا کرنے کا حکم دیا ہے بلکہ مرد اور عورت اس میں مسابقت کر سکتے ہیں جو آگے

نکل جائے وہی اللہ کا مطلوب اور پسندیدہ بندہ ہوگا، اب یہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے کوئی مرد یا عورت کہے کہ ان کے دائروں میں تو مجھ سے کردار ادا نہیں ہوتا ہم اپنے لئے اپنی مرضی کا میدان منتخب کرتے ہیں جہاں ہم اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائیں گے، اگر معاملہ یہ ہے تو پھر ہمیں درمیان میں کسی مذہب، سوسائٹی، اخلاقیات، حقوق، فرائض، تشخص، مقام وغیرہ کے ذکر کا تکلف نہیں کرنا چاہئے سیدھے سبھاؤ نفس پرستی اور ذہنی انارکی کی بات کرنی چاہئے کہ ہمارے جی میں جو آئے گا ہم وہی کریں گے اور وہی ہمارا حقیقی کردار ہے اور اسی کردار کی بحالی کے لئے ہم جدوجہد کررہے ہیں بحثیں کرتے ہیں، مذاکرے منعقد کرتے ہیں، وگرنہ قرآن وحدیث میں تو مرد اور عورت کو عمل کے میدان میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے پارہ بائیسواں، سورہ الاحزاب آیہ،۳۵۔

اس آیہ میں مرد اور عورت کو ایک ہی لقب اور خطاب سے مخاطب کیا گیا ہے جو خوبی مرد میں ہے وہی عورت میں ہے یعنی کسی بھی خوبی کا حصول جس طرح مرد کے لئے ضروری اور آسان ہے، اسی خوبی کا حصول عورت کے لئے بھی ضروری اور آسان ہے، اس معاملہ میں کوئی آزاد اور کوئی پابند نہیں، کوئی دو قدم آگے اور کوئی دو قدم پیچھے نہیں، ہر لقب اور خطاب کے ساتھ راقم الحروف اس کا مفہوم واضح کرتا جائے گا۔

(ان المسلمین والمسلمات) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں یعنی اگر مرد اسلام کی سعادت سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں تو عورتیں بھی اس سعادت میں برابر کی سطح پر شریک ہوسکتی ہیں، (والمومنین والمومنات) اگر مرد ایمان کی لذت سے آشنا ہوسکتے ہیں تو عورتیں بھی مومنہ کاملہ بن سکتی ہیں، (القانتین والقانتات) اگر مرد یکسو اور مخلص ہیں تو عورتیں بھی ایسی ہوسکتی ہیں، (الصادقین والصادقات) اگر مرد راستباز ہیں تو عورتیں بھی راستباز ہوسکتی ہیں، (الصابرین والصابرات) اگر باطل کے مقابلہ میں مرد حق پر ثابت قدم ہیں تو عورتیں بھی مجسمہ استقامت بن سکتی ہیں، (الخاشعین والخاشعات) اگر مرد خدا ترس ہیں تو عورتیں

بھی خدا ترسی کے اعلیٰ نمونے پیش کرسکتی ہیں، (**المتصدقین والمتصدقات**) اگر مرد ایثار پیشہ ہیں تو عورتیں بھی ایثار و قربانی کی داستانیں رقم کرسکتی ہیں، (**الصائمین والصائمات**) اگر مرد روزہ دار ہے تو عورتیں بھی روزہ دار ہوسکتی ہیں، (**الحافظین فروجھم الحافظات**) اگر مرد جنسی میلانات اور شہوانی ہیجانات پر قابو پاسکتے ہیں تو عورتیں بھی عصمت مآب اور عفت شعار بن سکتی ہیں، (**والذکرین اللّٰہ کثیرا والذکرات**) اگر مرد یاد الٰہی میں دن کی مصروفیت اور رات کا سکون قربان کرسکتے ہیں تو عورتیں بھی نماز گزار اور شب زندہ دار بن سکتی ہیں۔

ان تمام اعمال کا نتیجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ **ومن یعمل من الصالحات من ذکر اوانثی وھو مومن فاولئك یدخلون الجنہ** یعنی مرد ہو یا عورت جو بھی یہ اعمال صالح بجالائے گا وہ مومن ہے اور ایسے لوگ جنت کے حقدار ہیں، ظاہر ہے جب میدان سب کے لئے کھلا اور اجازت اور ترغیب سب کے لیے یکساں ہے تو نتائج بھی ایک جیسے برآمد ہوں گے جس کا مطلب ہے عورتیں گھر کی جنت، معاشرے کی جنت اور آخرت کی جنت میں برابر کی حصہ دار ہیں۔

سورہ النساء کی آیہ ۱۹۴ میں ارشاد الٰہی ہے **لااضیع عمل عامل منکم من ذکر اوانثی** (مرد ہو یا عورت جو بھی عمل کرے گا وہ رائیگاں نہیں جائے گا)

قرآن حکیم کے ان دو تین ارشادات میں یہ امر واضح ہوگیا کہ قدرت نے صلاحیت، اس کے اظہار، اور جذبہ مسابقت کے حوالے سے مرد کو فوقیت نہیں دی اور عورت کو محروم نہیں رکھا، دونوں اصناف مختلف ہیں مگر میدان یکساں، جہاں آ کر بات الجھ جاتی ہے وہ مرحلہ ہے میدان کے انتخاب کا، بس یہیں سے دو انتہائیں وجود میں آتی اور زخنہ بحثی کا دروازہ کھولتی ہیں، مسابقت کا میدان جو اللہ تعالیٰ نے طے فرمایا وہ ہے اسلام، ایمان، تقویٰ، عفت، ایثار، ذکر الٰہی، صبر، استقامت وغیرہ اس میں جو آگے نکل جائے گا وہی خدا کے تقرب کی منزل اور جنت پالے گا،

ہزاروں لاکھوں مردوں پر ایک آسیہؓ، ایک آمنہؓ، ایک فاطمہؓ، ایک مریمؑ، اور ایک رابعہ بصریؒ فائق اور بھاری ہیں۔

اگر ہم اپنی مرضی کا میدان منتخب کر لیں اور اس میں اندھی دوڑ شروع کر دیں یعنی فحاشی، بناوٹ، آرائش وزیبائش، اسراف، اظہار امارت، بے حجابی، تقلید مغرب، آوارگی، اور انتشار فکری کا میدان تو اس میدان میں قدم رکھنے کی کسی کو اللہ و رسول کی طرف سے اصولی اور حتمی طور پر جب اجازت ہی نہیں تو اس میں مرد اور عورت کی تخصیص کا کیا معنی؟ اور اس میں مساوات اور مسابقت کا کیا مطلب؟

حرام وحلال، جرم وثواب اور جائز و ناجائز کے ضابطے مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں ہیں، مرد بھانڈ نہیں بن سکتا تو عورت رقاصہ بننے پر کیوں اصرار کرے؟ مرد کے لئے فحش نگاری اور فحش کاری حرام ہے تو عورت کیوں اس ''فن لطیف'' میں اپنا حصہ مانگے؟ لیکن اس کے مقابلے میں تمام مثبت، تعمیری، پیداواری، صالح، مفید، بامقصد اور خوشگوار اعمال اور اشغال ہیں کون بدمذاق اور کوڑھ مغز عورت کو شامل کرنے سے روکتا ہے؟

جس دین اور قوم کی تاریخ میں سیدہ عائشہؓ ایسی نامور عالمہ اور فقیہ سیدہ سمیہؓ جیسی پیکر استقامت مومنہ، سیدہ فاطمہؓ جیسی عابدہ، سیدہ زینبؓ جیسی باوفا اور باحوصلہ، سیدہ رابعہؒ جیسی صالحہ اور سیدہ خولہؓ جیسی مجاہدہ خواتین ہو گزری ہوں وہاں عورتوں کو ثانوی حیثیت اور دوسرے درجے کا شہری قرار دینا کس طرح ممکن ہے؟ ہر مسئلے میں اُلجھاؤ پیدا ہو جانے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ہے ہر معاملے میں ہمارا کتابی زاویہ نگاہ! جبکہ واقعاتی اور عملی سوچ حقیقت کے زیادہ قریب ہوتی ہے، ظاہر ہے کتابی حوالوں اور واقعاتی حقائق کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا ہے اس لئے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہم انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب کوئی مملکت یا ملت انقلاب کے عمل سے گزر رہی ہو تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور جب وہ ساکت اور منجمد ہو تو اس کا مزاج کچھ اور ہوتا ہے، ہم بدقسمتی سے سکوت اور انجماد کی کیفیت میں

مبتلا ہیں اس لئے ہمارے ہاں بحث کا مطلب کج بحثی، فیصلے کا مطلب اندھی چھلانگ، رائے کا مطلب بے راہروی، اور عمل کا مطلب منزل ناشناسی ہے۔

کوئی قوم برسر عمل ہوتو اس کے لئے تجارتی منڈیاں، عملی ادارے، محاذ جنگ اور کھیت کھلیان سب ایک جیسے ہوتے ہیں جو جہاں کھپتا نظر آتا ہے اسے وہیں کھپا دیا جاتا ہے عام حالات میں بچے بوڑھے معاشرتی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہوتے ہیں لیکن اگر مرحلہ انقلاب اور جہاد اور تعمیر نو کا درپیش ہوتو زندہ قوموں میں جھولا جھولنے والا بچہ بھی پورے عمل کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کیونکہ کوئی ایسا انقلابی اور تعمیری مرحلہ درپیش نہیں اس لئے کلامی بحثیں اور محض فیشن ہمارے وقت کا سب سے بڑا مصرف ہیں اس لئے مختلف کمیٹیاں، مجالس، ادارے فقط لباس کی تراش خراش، آثار قدیمہ کی دریافت مقبروں کی تزئین، ہفتہ وار تعطیلات اور ایسے دیگر مشاغل پر تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔

جس طرح دریا میں ڈوبتے یا بھنور میں پھنسے شخص کو تیراکی کے سارے کتابی گر بھول جاتے ہیں اور وہ اس وقت خود ہی راہ، راہرو اور راہبر بن جاتا ہے اسی طرح جہد و عمل اور تعمیر نو میں مصروف قومیں ماضی کے لپشارے اور مستقبل کے مبہم خدشات کے گٹھے ایک طرف رکھ کر اپنا حال بچانے اور سنوارنے میں لگی ہوتی ہیں۔

اس وقت آزادی نسواں اور مساوات مرد و زن کے علمبردار اپنا سارا زور صرف اسی پر صرف کررہے ہیں، کہ عورت پائلٹ کیوں نہیں بن سکتی؟ عورتیں لبرٹی مارکیٹ اور انارکلی میں شاپنگ کیوں نہیں کرسکتیں؟ بیوٹی پارلر کیوں نہیں چلا سکتیں؟ فلم، ڈرامہ، کلب، اور تھیٹر میں کام کیوں نہیں کرسکتیں؟

حالانکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کن کن شعبوں کی تعمیر نو کی ضرورت ہے؟ کن کن خرابیوں کا سد باب ہونا چاہئے؟

کن کن کمزوریوں کو رفع کرنا اور کن کن اخلاقی خامیوں سے چھٹکارا پانا ہے؟ جس کے

باعث ہمارا معاشرہ تنزل، انحطاط اور زوال کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے اس طرف تو کوئی آتا نہیں البتہ ہمارا زور قلم اور فن خطابت اس پر صرف ہوتا ہے کہ عورت کی دیت نصف ہے یا پوری؟ شہادت مکمل ہے یا ادھوری؟ گویا یہ دو تین فیصلے ہو جائیں اور قوانین بن جائیں تو معاشرے کے سارے دکھ درد ختم ہو جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں گویا ہمارے لئے نسل نو کی پرورش و پرداخت، خاندانی نظام کا استحکام اور عفت و عصمت اتنے اہم مسائل نہیں جتنا کہ پوری دیت وصول کرنا اور اپنی شہادت کو مکمل منوانا اہم ہے۔

بات صرف دائرہ کار کی ہے مرد کا اپنا دائرہ کار اور عورت کا اپنا! اور دونوں کے لئے کھلا اور وسیع ہے، اسلام صرف حدود قائم کرتا ہے تا کہ کوئی ایک دوسرے کے دائرے میں داخل ہو کر فساد برپا نہ کرے اور معاشرے کو کسی بحران سے دوچار نہ کر دے، معاشرے میں کوئی وکیل ہے، کوئی ڈاکٹر ہے ہزاروں شعبے ہیں اب خوبی یہ نہیں کہ ہر وہ شخص جو وکیل ہے وہ ڈاکٹر بھی کہلانے پر اصرار کرے جو استاد ہے وہ انجینئر بھی ضرور رہو، اس طرح کچھ اوصاف مرد کے ہیں اور کچھ عورت کے اوصاف ہیں، رقت، عفت، نرمی، برداشت، لطافت یہ عورت کے اوصاف ہیں، جس معاشرے میں فقط شدت ہو وہ خونخوار معاشرہ بن جائے گا جہاں صرف رقت اور نرمی ہو وہ مجہول بن جائے گا قدرت نے جذب و اندفاع کے فطری اصول کو قائم کر کے انسانی معاشروں کو بقائے باہمی اور جہد و عمل کی ضمانت فراہم کر دی ہے۔

ویسے ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا عورت کے لئے نصف دیت اور نصف شہادت پر مناظرہ کرنا زیادہ ضروری ہے یا اپنی ساری شفقت کے ساتھ اپنے بچوں کی تربیت کر کے انہیں ارسطو، نیوٹن، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ اور سلطان ٹیپو بنا دینا زیادہ ضروری ہے؟

ملک کے لئے اچھے سپہ سالار، اچھے مدبر، اچھے سیاستدان اور اچھے وکلاء جس قدر ضروری ہیں اتنی ہی اچھی مائیں معاشرے کی ضرورت ہیں، یہ ہماری خانہ زاد تقسیم ہے کہ ائر ہوسٹس یا

پائلٹ بننا ماں کے منصب سے زیادہ معزز پیشہ ہے اور سیلز گرل ہونا خانہ دار خاتون کے مقابلہ میں زیادہ باوقار مشغلہ ہے۔

اس بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا تعلق عورت کی ملازمت اور حکمرانی سے ہے، اس ضمن میں کچھ نکات توجہ طلب ہیں انہیں ضرور زیر غور لایا جائے شاید کوئی نتیجہ خیز بات سامنے آسکے۔

ا۔ کیا تمام مرد اور معاشرے کے کارآمد افراد مختلف مناصب اور شعبوں میں کھپ چکے ہیں کہ اب مسئلہ صرف عورت کی ملازمت کا رہ گیا ہے؟

۲۔ کوئی ایسا کام اور شعبہ جس میں عورت کی صلاحیت اور مہارت کے بغیر بات نہیں بن سکتی تو ایسی جگہ عورت کی ملازمت پر کسی معقول آدمی کو کوئی اعتراض نہیں بلکہ سبھی بالاجماع اس پر متفق ہیں، مثلاً عورتوں کے آپریشن میڈیکل چیک اپ، خواتین کالج، یونیورسٹیاں، بلوغ عدم بلوغ کا سرٹیفکیٹ، عورتوں کا پوسٹ مارٹم وغیرہ۔

۳۔ کیا ہمارا اخلاقی نظام اس درجہ پختہ اور مستحکم ہے کہ عورت جہاں کام کررہی ہے اس کو اس کام کے حوالے سے دیکھا جائے گا کہ صنف نازک کے حوالے سے؟

ابھی ایک تجربہ ایران میں انقلاب کے بعد ہمارے سامنے آیا ہے وہاں عورتیں ہر جگہ کام کرتی نظر آتی ہیں، بڑے اعتماد مگر وقار کے ساتھ، ضرورت کے تحت نہ کہ نمائش کے طور پر، اور وہ بھی خاص قسم کے حجاب کے ساتھ۔

تمام دفاتر میں ویمن سیکشن موجود ہیں، شاپنگ سنٹرز ہیں جہاں تمام تر عورتیں کام کرتی ہیں، انہیں کوئی خوف اور اندیشہ لاحق نہیں، ہمارے یہاں مقصد حصول روزگار نہیں اور ہے تو بہت کم گھرانوں کا! دوش بدوش چلنے کا انہیں زیادہ شوق ہے جن کے ہاں کام کرنا عار اور حصول رزق امر زائد ہے، فقط شوق نمائش ہے اور ظاہر ہے یہ کوئی معقول اور ٹھوس جواز نہیں ملازمت کا، اپنے گھر چھوڑنے اور بچوں کو اپنی گود سے محروم کرنے کا!

اگر میدان کار میں ستر و حجاب کے تقاضے پامال نہ ہوں اور کام کاج معاشرے کی اہم

ضرورت اور خدمت ہوتو عورت اپنے ہنر، قابلیت، علم اور مہارت سے معاشرے کو ضرور فائدہ پہنچائے، اس میں قطعاً کوئی قباحت نہیں، ہماری اسلامی تاریخ اور معاشرت میں ہر جگہ عورتیں مردوں کی دوش بدوش رہی ہیں، جہاد میں، تعلیم وتدریس میں، کھیت کھلیانوں میں، بحران اور آزمائش کے دنوں میں ہر وقت اور ہر مقام پر عورتوں نے خدمت، محنت، وفا اور ہمدردی کے جوہر دکھائے، لیکن وہ ہر جگہ عورتیں ہی رہیں مرد بننے کی کوشش نہیں کی۔

رہا مسئلہ استقبالیہ افسر، پرائیویٹ سیکرٹری، سیلز گرل، ماڈل گرل، ایکٹرس اور گائیکہ بننے کا تو کم از کم ہمیں معلوم نہیں کہ یہ شوق کب اور کن دنوں میں ''قومی ضرورت'' کا درجہ اختیار کرتے ہیں۔

ہمارا بلکہ ہر انقلابی اور اسلامی معاشرہ چند بیمار ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے لئے اپنے اخلاقی ڈھانچے کو تہ وبالا نہیں ہونے دیتا۔

اسلامی انقلاب کے مراحل میں اور اس کی کامیابی کے بعد اور سوسائٹی کی تعمیر نو میں عورتوں کو میدان عمل میں آنا چاہئے بلکہ ضرور آئیں اور اپنا حصہ ادا کریں کیوں کہ وہ پوری انسانی آبادی کا نصف اور جوہر انسانیت کا بہتر نصف ہیں، لیکن ایک بات ملحوظ رہے کہ ان کا تعارف محض گیسو وکاکل سے نہیں بلکہ وہ اپنا تعارف علم وفضل اور اہلیت وعمل سے کرائیں۔

☆ ملتان کے بھائی محبوب حسین شاہ صاحب کی والدہ

☆ گوجرانوالہ کے بھائی محمد اشرف گھمن صاحب کی والدہ

رضائے الٰہی سے انتقال کر گئی ہیں۔ تمام بھائیوں سے ایصال ثواب کی استدعا ہے۔

معجزہ شق القمر پر امریکی تحقیقات

(علامہ چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ)

اسلامیان عالم کا ایمانِ پختہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس وبرکات نے اپنے فضل وکرم سے بنی نوع انسان کی رُشد وہدایت اور فلاح وبہبود کیلئے نبوت ورسالت کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس پر تمام ہوگیا یعنی حضرت محمد ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نہ تو اپنے کسی برحق نبی کو مبعوث فرمائے گا اور نہ کوئی بعثت رسول ہوگی۔ مسیلمہ کذاب جیسے جن لوگوں نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیات اقدس میں یا اس کے بعد اب تک جن لوگوں نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا، وہ باطل مدعیان نبوت تھے اور باطل مدعیان نبوت ہی قرار دیئے جاتے رہیں گے۔ جن مرسلین کرام وانبیاء علیھم السلام کے احوال دستیاب ہیں، انہیں عطائے نبوت وپیغام الٰہی کے ظلم وستم کا ہدف بن کر اپنی تبلیغ حقہ جاری رکھنا پڑی، گمراہ لوگوں نے ان کو بڑے کٹھن امتحانات میں ڈالا اور ان سے معجزات کے وقوع پذیر ہونے کا مطالبہ کرتے رہے۔ ویسے ہی یا ان سے بھی شدید، سخت اور کٹھن حالات نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی درپیش ہوئے اور آپؐ سے بھی معجزات دکھانے کے مطالبات کئے جاتے رہے۔ چنانچہ مٹھی میں بند کنکریوں کو گویائی عطا ہوئی اور انہوں نے کلمہ طیبہ کا ورد کیا، یمن کے معذور کو صحت عطا ہوئی، اسی طرح ہجرت سے 5 برس قبل مکہ مکرمہ میں منیٰ کے مقام پر جب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے کفار نے وہ شرط رکھی کہ آپ چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیتے تو کفار مان جاتے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قدرت وشانِ نبوت عطا فرمادی ہوئی تھی اور کفار اس کو تسلیم کر کے مشرف باسلام ہوجاتے۔ جس شب وہ مطالبہ کیا گیا اس شام ابھی چودھویں کا چاند بام اُفق پر جلوہ گر ہو رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری آب وتاب سے درخشاں ہوگیا تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت سے چاند کو

اشارہ فرمایا تو وہ تعمیل احکاماتِ نبوت میں فوراً دولخت گیا، شق ہو گیا اور پھٹ کر دو ٹکڑوں میں اس طرح بٹ گیا کہ ایک ٹکڑا تو کوہِ صفا پر اور دوسرا کوہ "کے کعان" (KAIKAAN) پر جا کر درخشاں ہو گیا اور پھر کچھ وقت کے بعد چاند کے وہ دونوں حصے باہم مل گئے مگر اِن میں ایک "شگاف اتصال" قائم رہا اور پہلی بار امریکی خلاباز و خلانورد (ASTRONAUT) نیل آرمسٹرانگ نے 20 جولائی 1969ء کو چاند پر اتر کر چلنے والے انسان کے طور پر زمین پر واپس پہنچ کر وہ گواہی دی کہ اس نے چاند پر ایک لکیر دیکھی جیسے چاند ٹوٹ کر پھر جڑا ہوا ہو۔ اس وقت بھی دنیا میں وہ گونج پیدا ہوئی کہ دُنیائے غیر مسلم کو معجزہ شق القمر کا ثبوت مل گیا ہے اور اس نے تسلیم کر لیا۔ پھر نیل آرمسٹرانگ جب مصر کے دورے پر گئے اور قاہرہ میں انہوں نے موذن کی آواز سنی تو ایک دم اپنے دورے کی ساری کاروائی چھوڑ کر اذان کی طرف متوجہ ہو گئے اور کہا کہ یہ آواز تو میں نے چاند پر اُترنے کے بعد بھی سنی تھی چنانچہ امریکہ نے اس شگاف کی تحقیقات پر کئی بلین ڈالرز خرچ کر دیئے ہیں اور ان پر ثابت ہوا ہے کہ چاند کی سطح پر اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جو دراڑ ہے، اس کے دو ٹکڑے ہو کر جڑنے کا ثبوت ہے، وہ محض سطحی دراڑ نہیں ہے بلکہ وہ دراڑ دور تک نیچے جاتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ اس بارے میں اب امریکی تحقیقاتی خلائی مرکز کی طرف سے چاند کی ایک تصویر بھی جاری کی گئی ہے جو چاند کے شق ہو کر دوبارہ جڑنے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ تصویر میں وہ چاند کی پتھریلی سطح میں صاف ایک شگاف کی علامت بنی ہوئی ہے اور اسے دیکھ کر کفار بھی معجزہ شق القمر کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہو چکے ہیں جبکہ قرآن مجید کی سورت القمر کی پہلی ہی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرما دیا ہے (ترجمہ) "قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا" پس حقیقت یہ ہے کہ 'شق القمر' کا واقعہ قرآن مجید کے صریح الفاظ سے ثابت ہے۔

قرآن مجید کے اس مختصر بیان کی تفصیلات روایات سے معلوم ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا۔ یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی،

عبدالرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی اور ابونعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت جبیر بن مطعمؓ سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ اور حضرت جبیر بن مطعمؓ تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اس وقت مشرکین مکہ نے نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ اگر آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں تو پھر آپ چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھائیں اور اگر آپ نے وہ معجزہ کر لیا تو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے معبودِ واحد اور وحدہ لاشریک ہونے اور آپؐ کے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے سچا رسول ہونے پر ایمان لے آئیں گے۔ اس شب چاند پورا تھا یعنی چودھویں کا چاند تھا چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہو کر اپنی انگشت شہادت سے چاند کو اشارہ کیا تو وہ دو لخت ہو گیا، اس کا نصف حصہ کوہ صفا اور نصف کوہ ''کے کعان'' پر جا کر درخشاں نظر آنے لگا۔ اس پر مشرکین مکہ نے حیرت واستعجاب کے عالم میں کہا کہ ''حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہم پر جادو کر دیا ہے لیکن اگر انہوں نے ہماری نظر بندی کر دی ہے اور ہمیں مسحور کر کے چاند کو دو لخت دکھا دیا ہے تو پھر بھی وہ ساری دنیا کے لوگوں کو تو مسحور نہیں کر سکے ہوں گے چنانچہ ابوجہل نے کہا کہ ہمیں ان لوگوں کا انتظار کرنا چاہئے جو ''البادیہ'' سے سفر کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اگر انہوں نے تصدیق کر دی کہ انہوں نے بھی چاند کو اس وقت دیکھا جب وہ دو ٹکڑے ہو چکا تھا تو پھر تو حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معجزہ ایک جیتی جاگتی صداقت ہو گا اور اگر ''البادیہ'' سے آنے والوں نے اس واقعہ کی تصدیق نہ کی تو ہم سمجھیں گے کہ ہمیں مسحور کر کے چاند کو دو لخت دکھا دیا گیا۔ چنانچہ جب البادیہ سے قافلے مکہ پہنچے تو ان قافلوں میں شامل لوگوں نے تصدیق کر دی کہ واقعی انہوں نے بھی چاند کو دو لخت ہو کر اور شق ہو کر اور دو ٹکڑے ہو کر کوہ صفا اور کوہ ''کے کعان'' پر چمکتے ہوئے دیکھا مگر کچھ وقت کے بعد چاند کے وہ دونوں ٹکڑے پھر اس

طرح آپس میں مل گئے کہ چاند جڑ گیا مگر مشرکین مکہ نے حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کی صداقت پر ایمان لے آنے کے بجائے کہا کہ "واقعی حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کا جادو کتنا طاقتور ہے"۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس وبابرکات نے واقعہ شق القمر کی صداقت کے ثبوت وتصدیق میں سورۃ القمر نازل فرمائی جس میں فرمایا کہ (ترجمہ) "قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند (دو ٹکڑے ہو گیا) پھٹ گیا مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، منہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلتا ہوا جادو ہے"۔ اُنہوں نے (اس واقعہ کو بھی) جھٹلا دیا اور اپنی خواہشاتِ نفس ہی کی پیروی کی، ہر معاملے کو آخر کار ایک انجام پر پہنچ کر رہنا ہے"۔ چنانچہ گزشتہ 14 سو سال سے مشرکین وکفار معجزہ شق القمر پر بحث کرتے چلے آ رہے ہیں اور جب سے امریکی خلائی تحقیقاتی سائنس دان اس حقیقت سے آگاہ ہوئے ہیں اور اُنہوں نے شق القمر کی تصدیقی تصاویر اُتاری ہیں، انہوں نے واقعہ شق القمر کی تحقیقات شروع کر دی اور اب تک کئی بلین ڈالرز اس پر خرچ کر چکے ہیں۔ حال ہی میں اس بارے میں بی بی سی نے ایک پروگرام میں تین امریکی سائنس دانوں سے مذاکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس عہد میں جبکہ کروڑوں لوگ بھوک سے بلک رہے ہیں، تم لوگ بلاوجہ کئی بلین ڈالرز شق القمر کی تحقیقات پر خرچ کر رہے ہو تو سائنس دانوں نے کہا کہ خلائی تحقیقات بہت ضروری ہے اور وہ دیکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ آیا واقعی چاند شق ہوا تھا جیسا کہ اس کی سطح سے معلوم ہو رہا ہے۔ چنانچہ زندہ دلان لاہور بھی اس امریکی خلائی تحقیقات میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں جو معجزہ شق القمر کی تصدیق کر رہی ہے۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف وکرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت روا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد واذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چاردیواری کے اندر احسن طریقے سے ہو سکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب ونظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہو کر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اِس میں غرق ہو جانے کی۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

تعمیر ملت

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ
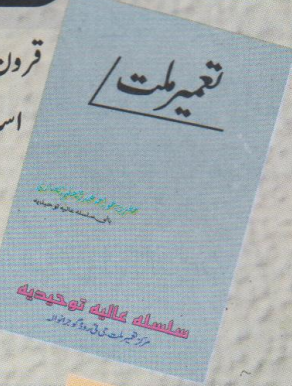
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ
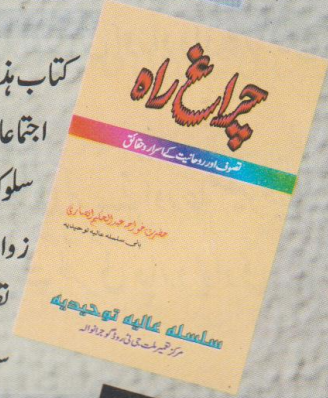
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان
زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین
کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا
اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔